وسط ایشیا

نئی آزادی، نئے چیلنج

آصف جیلانی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وسط ایشیا

نئی آزادی، نئے چیلنج

آصف جیلانی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

Waste Asia
by
Asif Jilani
Rs.88/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ 110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔ 400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ 202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2012 تعداد: 1100 قیمت: -/88

ISBN :978-81-7587-784-9 سلسلۂ مطبوعات: 1625

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025
فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: میکاف پرنٹرس، 2847، بلبلی خانہ، ترکمان گیٹ، دہلی۔ 110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ ناساعد حالات نے سست رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزمِ سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلّی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبولِ خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہلِ علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دور، ان بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلاشرکتِ غیرے شائع کی ہیں)۔ زیرِ نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابلِ فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اربابِ حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُر خلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اوّلین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاچکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہورہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
مینجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

ترتیب

بی بی سی لندن کی اردو نشریات سننے والے ان کروڑوں افراد کے نام جن کا شوق جستجو اور اپنے گاؤں' اپنی بستی' اپنے قصبے' اپنے شہر اور اپنے ملک سے باہر کے حالات جاننے کی خواہش' میرے سفر میں ہر لمحہ میرے ساتھ رہی۔

تعارف

آصف جیلانی علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔
ابتدائی تعلیم اور تربیت جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی میں ہوئی۔ ثانوی تعلیم سندھ مدرسہ کراچی
میں حاصل کی، سندھ مسلم کالج سے گریجوشین
کیا اور کراچی یونی ورسٹی سے معاشیات کے
مضمون میں فارغ التحصیل ہوئے۔

صحافتی زندگی کا آغاز دورانِ تعلیم ہی
۱۹۵۲ء میں روزنامہ امروز کراچی سے کیا۔
ہفت روزہ لیل ونہار کے بھی کراچی میں
نمایندے رہے۔ ریڈیو پاکستان کراچی
سے بچوں کے پروگرام میں بچوں کا اخبار
شروع کیا اور دوسرے پروگراموں میں
حصّہ لیا۔

۱۹۷۳ء میں روزنامہ جنگ لندن کے

اڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں انڈونیشیا میں
اسلامک ماس میڈیا کی پہلی کانفرنس میں
برطانوی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔

۱۹۸۲ء میں بی بی سی لندن کی اُردو
نشریات کے عملہ میں شامل ہوئے۔ ۱۹۸۴ء میں
یورپ میں ایشیائیوں کی زندگی کے بارے میں
پروگراموں کی سیریز کی۔ ۸۸ء میں برصغیر کے
بڑے بڑے شہروں کے مسائل پر "شہر بے کراں"
کے عنوان سے پروگراموں کا سلسلہ نشر کیا۔
۱۹۹۱ء میں مشرقی جرمنی کے تاریخ ساز انتخابات
کے کوریج کے لیے برلن بھیجے گئے اور کمیونزم
سے آزاد ہونے والے مشرقی یورپ کے ملکوں
کے بارے میں سیریز کی اور ۱۹۹۲ء کے
اوائل میں، وسط ایشیا کی نو آزاد مسلم
جمہوریاؤں کا دورہ کیا۔

سفر کیوں؟

کیسپین کے ساحل سے چین کی سرحد تک پھیلا ہوا وسط ایشیا کا وسیع و عریض علاقہ' شمال میں جس کی حدیں روسی سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں کو چھوتی ہیں اور جنوب میں' افغانستان اور ایران سے ملتی ہیں' ڈیڑھ سو سال پہلے توران یا ماوراء النہر کہلاتا تھا---- ماوراء النہریوں کا یہ علاقہ' دریائے جیحوں کے اس پار ہے۔

سیر' کارا' زر افشاں اور آمو دریاؤں کی سرسبز اور زرخیز زمین' جس کے بطن میں سونے' چاندی' یورینیم گیس اور تیل کے وافر ذخائر ہیں اور جس کے میدانوں میں کپاس اُگتی ہے اور باغات پھلوں سے لدے رہتے ہیں' ایک طرف پامیر کے برف پوش پہاڑوں کے میدانوں کو چھوتی ہے تو دوسری طرف ترکمانستان کے ریگستان کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔

وسط ایشیا کی اس سرزمین سے زرتشتیوں کا قدیم ترین مذہب اُبھرا اور چونکہ یہ علاقہ' جہاں سے ایک زمانہ میں شاہراہ ریشم گزرتی تھی' زبردست فوجی اور اقتصادی اہمیت کا حامل رہا ہے' یہی وجہ ہے کہ یہ زمین ایک دوسرے سے نبرد آزما سلطنتوں کی آماجگاہ بنی اور اس پر پے درپے طالع آزماؤں اور توسیع پسندوں کے طوفانوں کی یلغار رہی ہے۔

تین سو سال قبل مسیح میں یہ سرزمین سکندر اعظم کی تابع رہی ہے---- پھر ساتویں اور آٹھویں صدی میں اس نے عربوں کی فتوحات کے ساتھ اسلام قبول کیا اور

بہاء الدین نقش بندی' امام بخاری اور ترمذی ایسے بزرگ' عالم دین' محدث اور فقیہ ابھرے۔ ۱۳ ویں صدی میں منگولیا سے چنگیز خان کی سفاکی' تباہی اور بربادی کا طوفان اٹھا جس نے اس علاقہ کی زندگی اور تہذیب کو نیست و نابود کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

لیکن تین نسلوں کے بعد چنگیز خان کا خاندان خود باہمی رقابتوں کا شکار ہو گیا اور اس علاقہ میں تیموری دور کا سورج طلوع ہوا ـــــ تیمور لنگ اور ظہیر الدین بابر نے برصغیر کی تاریخ اور تہذیب پر ایسے گہرے نقوش چھوڑے جن کو کئی صدیوں کی گرد بھی نہیں مٹا سکی ہے۔

تیموری خاندان کے درخشاں دور کے بعد اس علاقہ پر توسیع پسندی کا ایک اور طوفان امڈا ـــ چنگیز خان کا ریلا مشرق سے آیا تھا' اس بار یہ طوفان شمال میں روس سے اٹھا اور اس کے نتیجے میں ۱۸۷۳ تک اس پورے علاقہ پر زار روس کا تسلط چھا گیا اور اس مناسبت سے اس کا نام روسی ترکستان پڑ گیا۔

پھر ستر سال پہلے روس ہی کی سمت سے ایک اور طوفان اٹھا۔ یہ کمونسٹ انقلاب کا طوفان تھا۔ اس طوفان نے ان تمام علاقوں کو اپنی گرفت میں لے لیا جہاں جہاں زار روس کا اثر تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک نئی سلطنت نے زار روس کی سلطنت کی وراثت سنبھال لی ہے۔

کمونسٹ تسلط کے دوران اس پورے علاقہ کا سرے سے نقشہ ہی بدل گیا۔ کمونسٹوں نے نہ صرف اس علاقہ پر اپنا نظریاتی نظام' مرکزی منصوبہ بند معیشت اور روسی زبان مسلط کی بلکہ اسے پانچ جمہوریاؤں میں تقسیم کر دیا اور آبادی کے تناسب کو درہم برہم کر دیا۔

۱۹۹۱ کے آخر میں سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد ان جمہوریاؤں کو آزادی نصیب ہوئی۔

آزادی کے بعد ان جمہوریاؤں کے عوام کی کیا خواہشات اور تمنائیں ہیں' اپنے مستقبل کے بارے میں کیا اندیشے ہیں اور کیا خطرات ہیں اور ان جمہوریاؤں کی

سیاست کیا کروٹ لے رہی ہے۔ معیشت کا کیا حال ہے' پرانا نظام کس طرح بدل رہا ہے۔ آزادی کہاں تک حقیقی ہے اور کیا آزمائشیں اور چیلنج ہیں---- ایسے بہت سے سوالات اپنے ذہن میں لیے میں نے ۹۲ء کے اوائل میں وسط ایشیا کی ان نو آزاد جمہوریاؤں کا سفر کیا تھا۔

اس سفر میں میں نے عام لوگوں سے بات کی' سیاسی اور مذہبی رہنماؤں سے گفتگو کی' دانشوروں' ادیبوں' شاعروں اور صحافیوں سے تبادلہ خیال کیا اور وہ تاریخی مقامات دیکھے جن سے اس علاقہ کی قدیم تہذیبی' مذہبی اور ثقافتی روایات وابستہ ہیں اور جن پر نہ صرف اس سرزمین کو بلکہ برصغیر اور عالم اسلام کو فخر ہے۔

وسط ایشیا کی ان جمہوریاؤں کے سفر کے آغاز پر ہم اس علاقہ کے تاریخی پس منظر اور خاص طور پر برصغیر کے ساتھ اس کے پرانے رشتوں' تاریخی وابستگی اور جذباتی تعلق پر نظر ڈالیں گے۔

وسط ایشیا کے سب سے پرانے باشندے تاجک ہیں جو چین اور افغانستان کی سرحد پر آباد ہیں۔ یہ فارسی بولتے ہیں۔ چین کی سرحد کے ساتھ ساتھ کرغیز اور قزاق رہتے ہیں۔ مغرب میں ازبک اور ترکمان آباد ہیں۔ ان کی زبانیں مختلف ہیں لیکن یہ سب ترک نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ چار سو سال قبل مسیح میں اس علاقے میں ان چالیس قبائل کی حکمرانی تھی جن کی سردار نہایت حسین و جمیل لیکن بے حد جنگجو اور خود دار خواتین تھیں۔ تاشقند یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر' پروفیسر آزاد شاکوف اس علاقے کی قدیم تاریخ کا پس منظر یوں بیان کرتے ہیں:

"کرغیز لفظ کا مطلب ہے' ترکی شناس لوگوں کی نظر میں' چالیس لڑکیاں---- اسی نام سے ایک پرانا ایپک بھی ہے جو سنٹرل ایشیا میں بہت مشہور ہے۔ یونانی مورخوں کے ہاں بھی اس کا ذکر ہے' مثلاً ہیرودوتس میں بھی ایسا کہتہ ہے کہ سنٹرل ایشیا میں پرانے زمانے میں ایسے زنانے قبیلے رہتے تھے جن کو انگریزی میں Amazons کہتے ہیں' جو بہت جنگ جو لڑاکا اور بہت خوددار ہوتے تھے' اپنے آپ کو کسی کے سپرد نہیں

کرتے تھے اور شاید انہی اے زونس سے "کرغیز" یعنی چالیس لڑکیوں کی روایت وابستہ ہے۔" اردو میں لفظ قزاق نے نہ جانے کیسے راہ زن اور لٹیرے کے مفہوم کا لبادہ اوڑھ لیا ہے؟ لیکن پروفیسر آزاد شاتوف کا کہنا ہے کہ اس لفظ کے اصل معنی بالکل مختلف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "ایتھنو سولوجیکل کے طور پر یعنی پیدائش کے لحاظ سے قزاق کا مطلب ترکی زبانوں میں ہے: وہ شخص جو اپنے قبیلہ سے الگ ہو گیا ہو۔۔۔"

میں نے پوچھا کہ علیحدگی پسند تو نہیں کہیں گے؟

پروفیسر شاتوف نے کہا کہ "علیحدگی پسند تو نہیں کہیں گے مگر ایسا آدمی جو اپنے قبیلہ سے الگ ہو گیا ہو' وجہ جس کی ہم کو معلوم نہیں۔"

وسط ایشیا کی اسی زمین سے شیریں فرہاد کی داستان وابستہ ہے اور جہاں اس سرزمین کو علی شیر نوائی' رودکی اور مخدوم قلی ایسے عظیم شعرا پر فخر ہے تو دوسری طرف اسے اس پر ناز ہے کہ اس نے دنیا کو فارابی' ابن سینا اور البیرونی ایسے فلسفی' ریاضی دان' سائنس دان اور علم نجوم کے ماہر دیے۔۔۔ پھر تیمور اور بابر نے برصغیر کے ساتھ ایسے تاریخی اور تہذیبی رشتے استوار کیے جو زندۂ جاوید ثابت ہوئے۔

برصغیر سے وسط ایشیا کے روابط کا آغاز کب ہوا؟ ازبکستان کے ممتاز دانشور اور اردو داں ڈاکٹر تاش مرزا اس کے تانے بانے یوں تلاش کرتے ہیں:

"میں سب سے اول شروع کروں گا بابر سے کہ وہی ایک کڑی ہے' وہی ایک فرد ہے' شخصیت ہے' جو ہم کو اور آپ کو ملاتی ہے۔ بس بابر سے لے کر یہ ساری ہماری کہانی' یہ ساری تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اور کوہ قاف کی پریوں کی بات کروں گا۔ کوہ قاف کی پریوں کے خواب دیکھتے آئے ہیں پاکستانی' میں جانتا ہوں اور شاید یہ صحیح بھی دیکھتے تھے کہ واقعی یہاں پریاں ملتی ہیں۔

تو یہ ہے سب سے بڑی بات جو پاکستان اور ازبکستان کو ملاتی ہے۔ بلاشبہ ہمارے ماضی کے رشتے اور ہمارے روابط دین ہیں بابر کے۔

واقعی پاکستان اور ہندوستان میں

جو اسلام ہے وہ روایتی طور پر سنٹرل ایشین اسلام ہے۔ میرے کچھ پاکستانی دوستوں کا

کہتا ہے اور یہ خیال صحیح بھی ہے کہ ہم زیادہ تر وسط ایشیائی مسلمان ہیں بہ نسبت سعودی کے۔۔ کیونکہ صرف مذہب نہیں' یہاں ثقافت اور تہذیب ہے ہماری مشترک۔"

میں نے ڈاکٹر تاش مرزا سے پوچھا کہ کیا یہ صحیح نہیں کہ یہاں وسط ایشیا میں انداز فکر زرتشتی ہے اور یہاں کی ثقافت پر چھاپ بھی زرتشتی ہے جب کہ برصغیر میں جو مسلمان ہیں ان کا بنیادی طور پر اندازِ فکر ہندوستان' اور ہندو تہذیب سے جڑا ہوا ہے۔؟

ڈاکٹر تاش مرزا نے جواب دیا: "نہیں مجھے ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں اور یہاں کے مسلمانوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ علاقہ زرتشتی اثر میں رہا ہے لیکن زرتشتیوں کا اثر یہاں کے اسلام پر نہ ہونے کے برابر ہے۔ ازبکستان کے صرف چند علاقوں میں آپ کو کچھ کچھ زرتشتی اثر اب بھی نظر آئے گا۔ مثلاً یہاں ہمارے ہاں شادی پر آگ کے اطراف طواف کیا جاتا ہے' یہ شاید زرتشتیوں کا اثر ہے۔۔۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان میں بھی یہ طریقہ رائج ہے۔ یہ شاید ہندوانی اثر ہے۔ ویسے یہاں ہم جب قبرستان جاتے ہیں تو ہم پھول نہیں چڑھاتے قبروں پر یا کوئی اگربتی نہیں جلاتے۔۔۔ لیکن یہ اتنی بنیادی باتیں نہیں ہیں۔"

بہرحال ۱۹۱۷ء کے کمونسٹ انقلاب تک وسط ایشیا کے برصغیر سے بڑے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ اسلام آباد کی قائد اعظم یونیورسٹی میں وسط ایشیا کی تہذیب کے مطالعہ کے مرکز کے سربراہ ڈاکٹر احمد حسن دانی ماضی کے اوراق یوں پلٹتے ہیں:

"دراصل وسط ایشیا اور ہندوستان اور پاکستان میں جو مسلمان رہتے ہیں ان کے ساتھ ان کا بڑا گہرا تعلق نہ صرف اسلام کے آنے کے بعد بلکہ اس سے پہلے سے رہا ہے' ہمیشہ سے لوگ وسط ایشیا سے جس کو آج ہم ازبکستان' تاجکستان' ترکمانستان' قزاقستان اور کرغیزستان کہتے ہیں۔۔ یہاں سے لوگ افغانستان کے راستے سے اور خیبر کے راستے سے پاکستان اور پاکستان سے آگے ہندوستان جاتے رہے ہیں بلکہ ہمارے ہاں مسلمانوں میں جتنے حکمران رہے ہیں شروع سے لے کر۔ محمود غزنوی سے لے کر

آخر تک' مغلوں تک وہ سارے حکمران اسی خطہ سے آتے رہے ہیں۔ نہ صرف حکمران' بلکہ شاعر بھی' مصور بھی مجسمے بنانے والے اور آرکی ٹیکٹ بھی' سارے کے سارے وسط ایشیا سے ہمارے ہاں آتے رہے ہیں' بلکہ مغلوں کے دور میں تو یہ سلسلہ تھا کہ جیسے آج کل ہم کہتے ہیں کہ ہندوستان' پاکستان یا ایشیا یا افریقہ سے "برین ڈرین" امریکہ کو ہوتا ہے اس زمانے میں "برین ڈرین" وسط ایشیا سے ہندوستان اور پاکستان کو ہوا کرتا تھا اور اگر کسی مغل بادشاہ کو کوئی خاص فوجی ماہر یا کوئی مورخ یا کوئی شاعر یا کوئی مصور اچھا بلانا ہوتا تھا تو وہ وسط ایشیا ہی سے جایا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ہماری زبان اردو کا جو نام ہے وہ بھی وسط ایشیا کی قزاقی زبان کے لفظ "یورتا" سے نکلا ہے۔ "یورتا" کے معنی ہیں کیمپ یا خیمہ۔ اور اسی لفظ سے انگریزی کا لفظ "ھورڈ" نکلا ہے۔ کیونکہ قزاقستان کے لوگ خانہ بدوش تھے جو ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کیمپ میں جایا کرتے تھے یعنی ایک ساتھ ایک فیملی میں جس کو یہ "یورتا" کہتے ہیں اور اردو بھی کہتے ہیں اور چونکہ ہمارے فوجی بھی کیمپ میں رہتے تھے تو اس کیمپ کو اس زمانے میں اردو کہا جاتا تھا اور وہاں جو زبان بنی اس کو ہم نے نام اردو کا دیا۔"

بہرحال یہ تو ہو گیا پرانا قصہ۔

میں نے ڈاکٹر وانی سے کہا' مگر انگریزوں کے زمانے میں تو وسط ایشیا اور برصغیر کے درمیان تعلق بڑی حد تک ختم ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر وانی نے کہا کہ "ہوا کیا کہ جب انگریزوں نے اپنا تسلط ہندوستان کے برصغیر پر جمایا اس سے کچھ سال پہلے زار روس نے اپنا تسلط وسط ایشیا میں جمانا شروع کیا تھا۔ دھیرے دھیرے انہوں نے یورال کو عبور کیا' پھر سائیبریا میں وہ آئے' پھر سائیبریا سے وہ دھیرے دھیرے سیر دریا پر آئے' پھر اس کے بعد انہوں نے کوقند' بخارا' سمرقند اور خیوا کو فتح کیا اور یہاں پر اپنی حکومت جمائی' اس وقت بھی جب زار روس کی حکومت تھی' تب بھی تجارت پشاور سے لاہور سے شکار پور سے بخارا کے ساتھ ہوتی تھی' سمرقند کے ساتھ ہوتی تھی۔ میری اپنی فیملی' تجارت کے لیے وہاں جایا کرتی تھی۔۔۔ بخارہ جایا کرتی تھی۔۔۔ لیکن ۱۹۱۷ میں جب سے کمونسٹ انقلاب آیا تب سے ہمارا
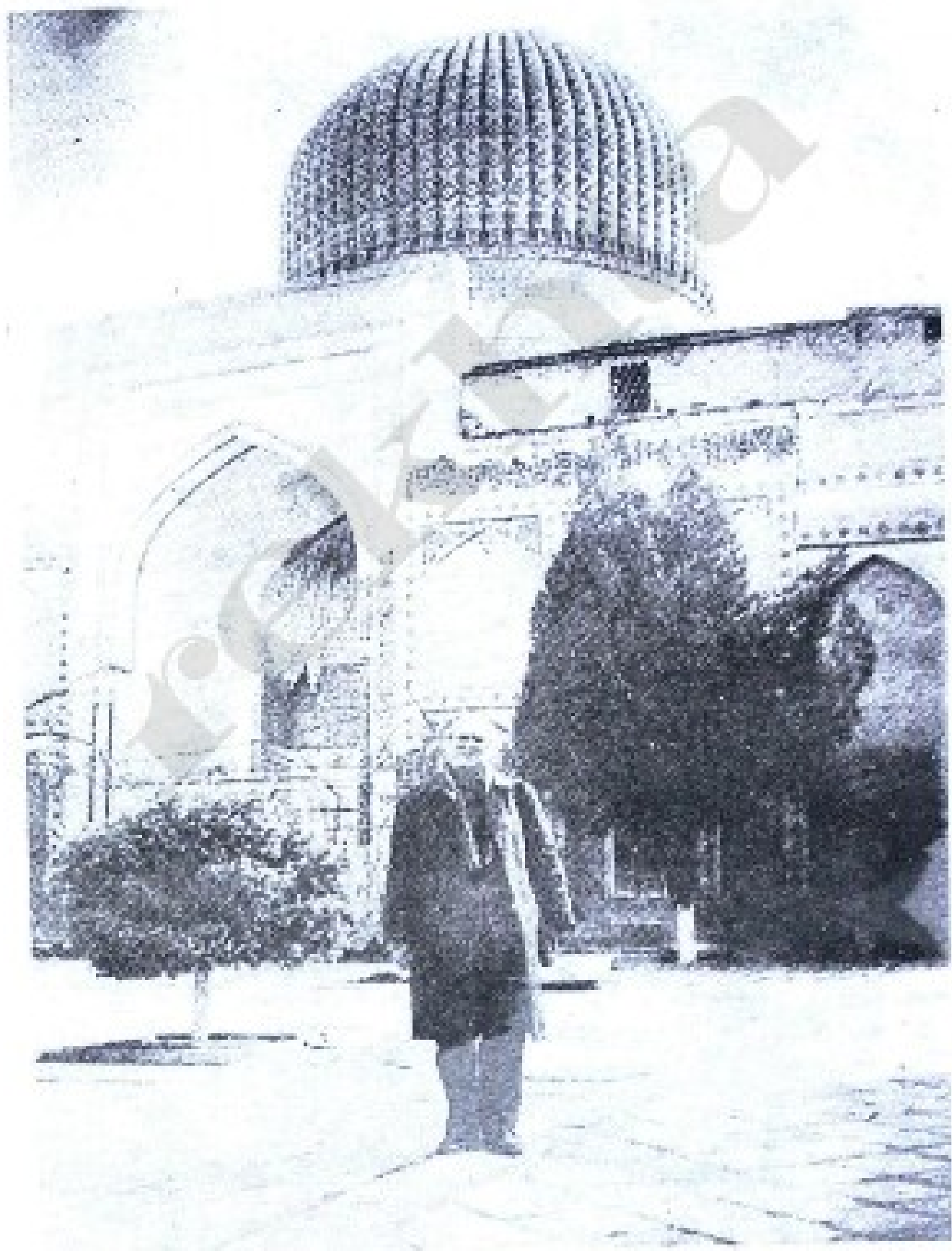
بی بی خانم مسجد (سمرقند)

امام بخاری کا مقبرہ۔ ثقافت کا حسین امتزاج (سمرقند)

شاہ زندہ (سمرقند)

تیمور لنگ کا مقبرہ (سمرقند)
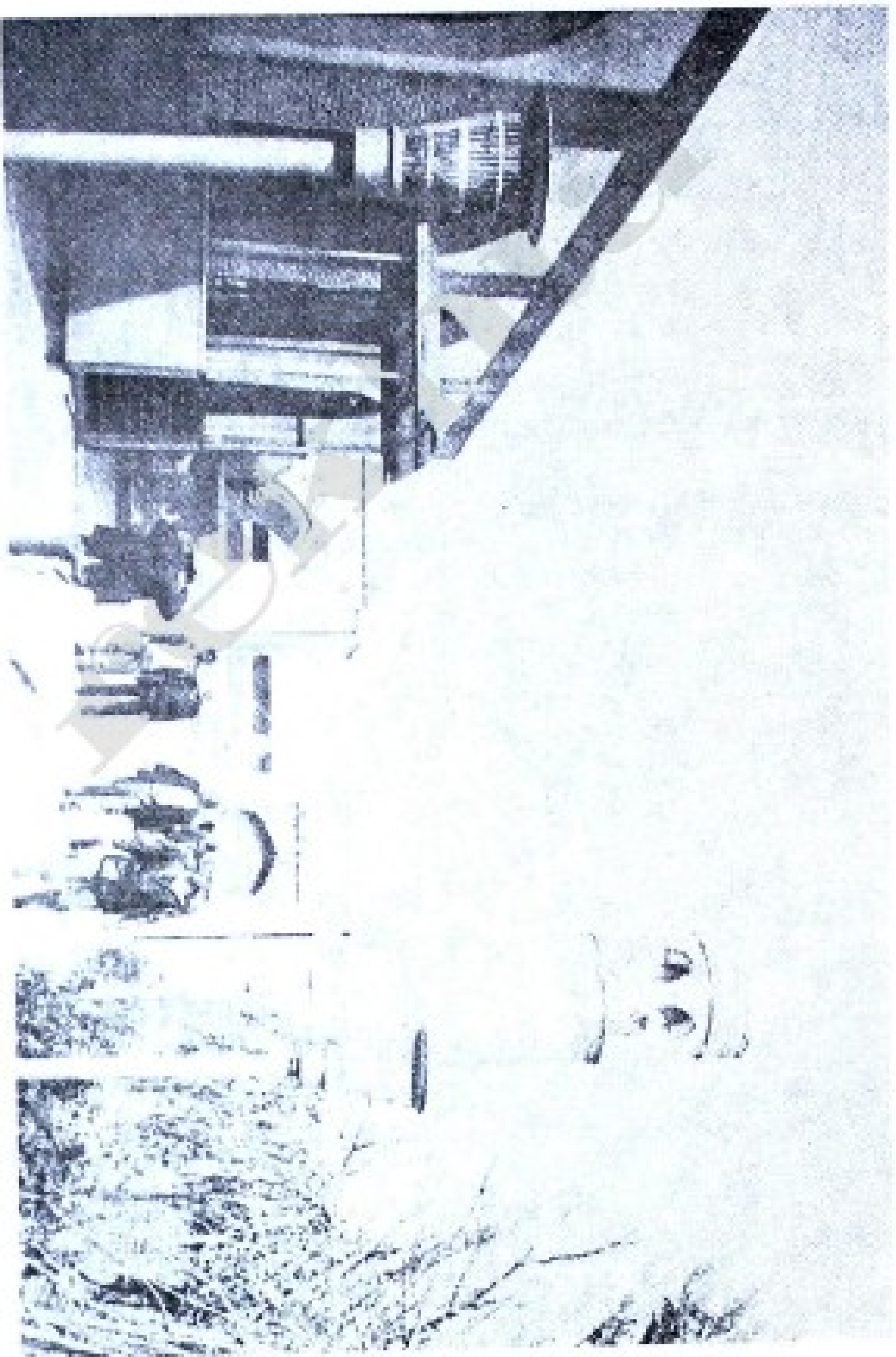
مقبرہ امام بخاری (ثمرقند)

تاشقند میں زیرِ تعمیر مسجد کی جگہ پر صدر غالب اہلِ محلہ کے ساتھ

غالب محلہ تاشقند میں شادی کی ایک تقریب

غالب محلہ تاشقند میں ایک ازبک خاندان کے ساتھ

الماآتا مارکیٹ
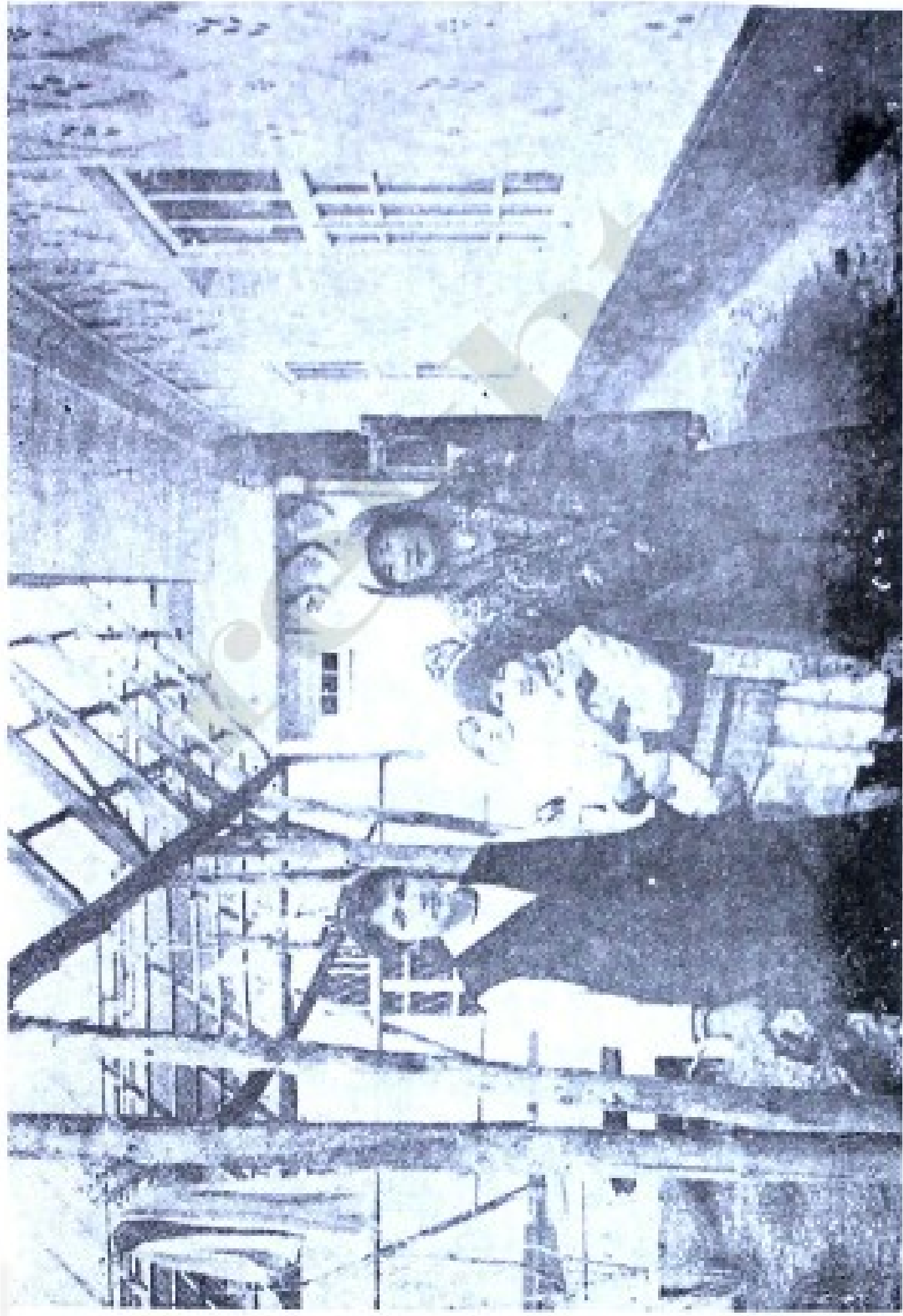
ازبکستان میں بابر کے آبائی گھر ازبک نامن گان کا ایک اندرونی منظر

جامع مسجد الماآتا قازکستان)

بابر کی جائے پیدائش نزد نامن گان (ازبکستان)

۱۹۵۰ء
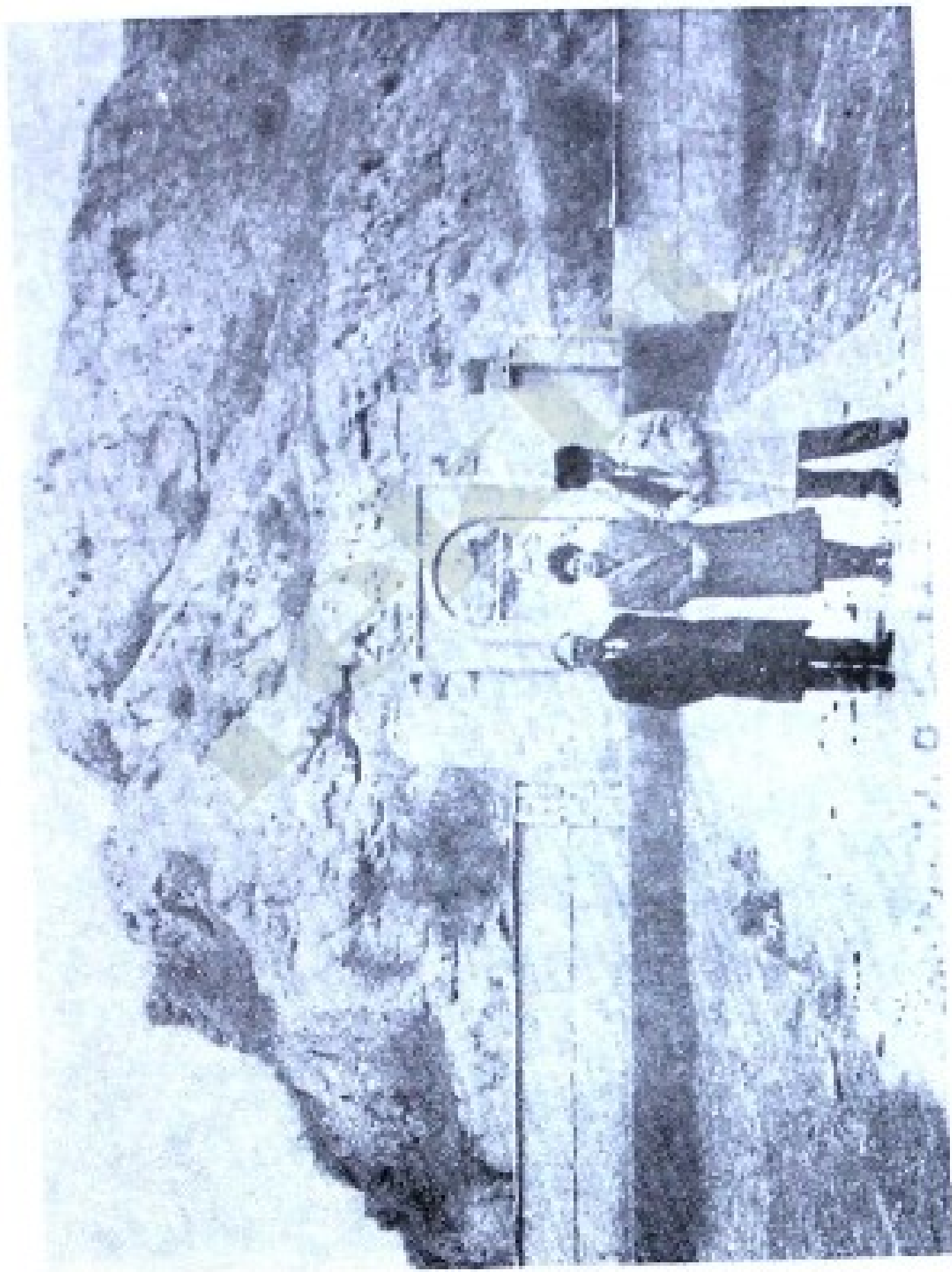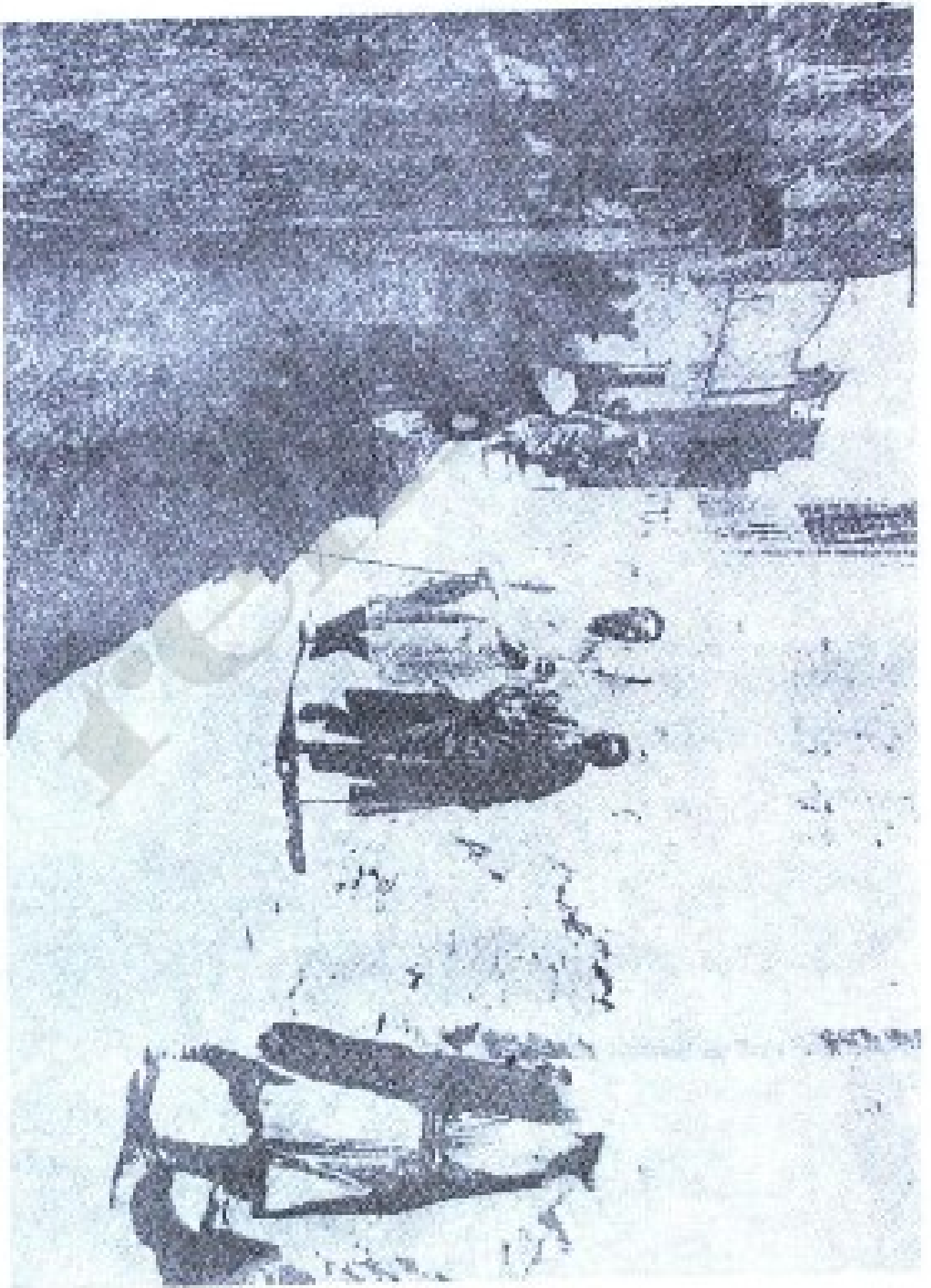
بخارہ کی ایک خاتون
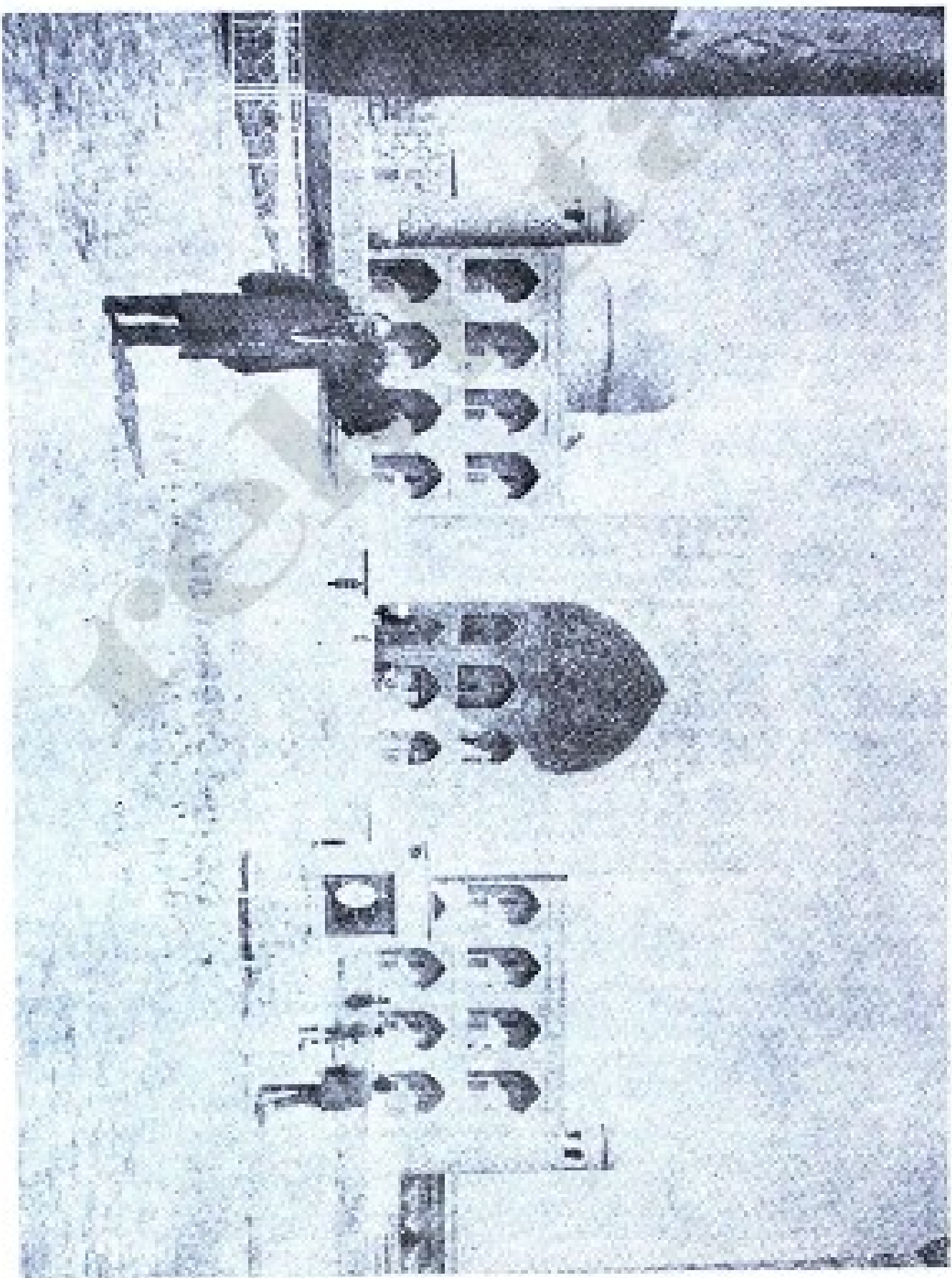
تیمور کا تعمیر کردہ اسلامی مدرسہ (ثمرقند ایس۔ یو)

محمد صادق اور محمد یوسف تاشقند میں وسطی ایشیا کے مفتی کے ساتھ
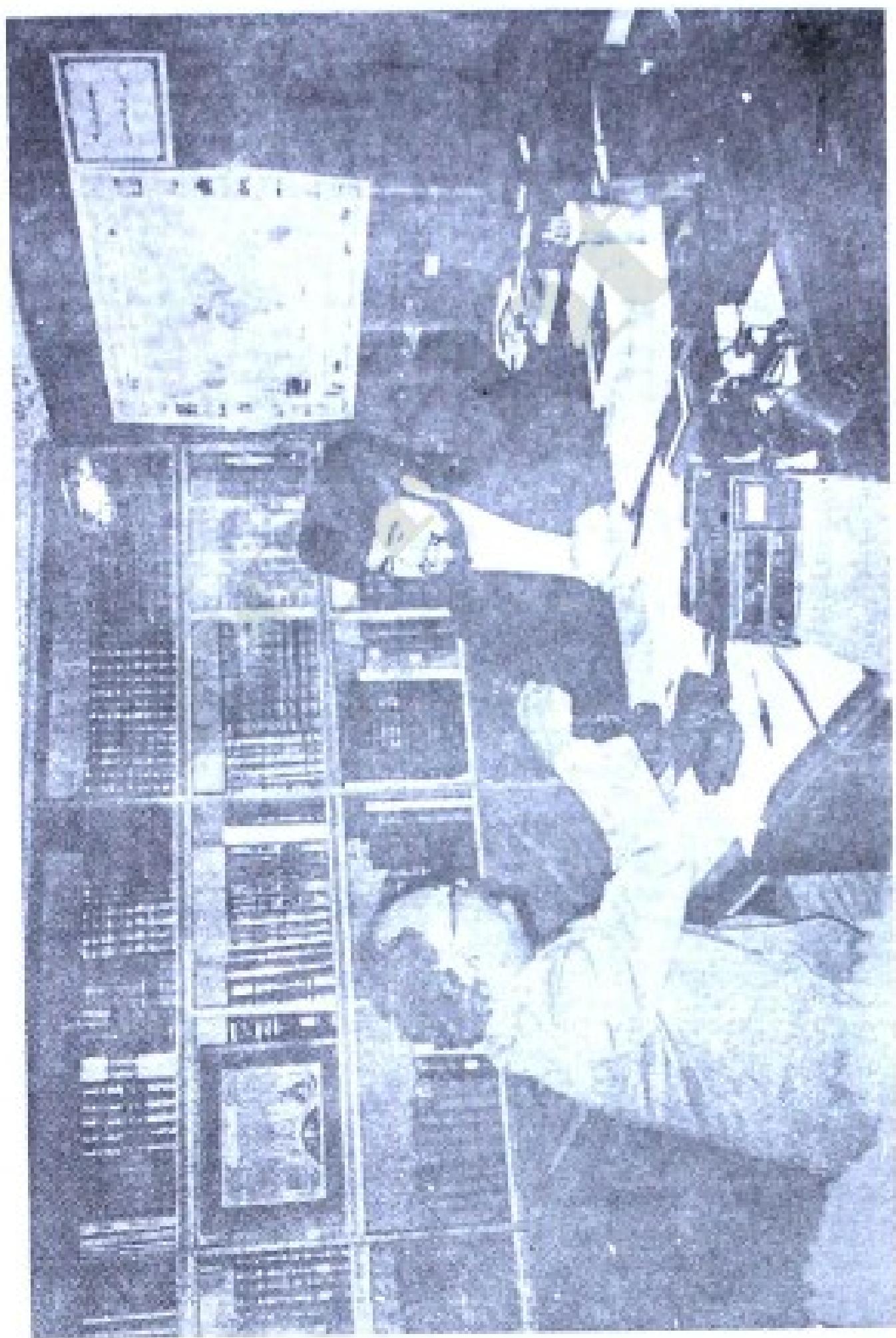
تعلق بالکل چھوٹ گیا' اس کے بعد سے ہندوستان سے وہاں جانا قریب قریب ختم ہو گیا۔"

یہ تو تھی ماضی کی داستان' اب سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد اس علاقہ کی مسلم جمہوریاؤں کے پیروں میں پڑی کمونسٹ نظام کی زنجیریں ٹوٹی ہیں اور انھیں آزادی نصیب ہوئی ہے۔۔

وسط ایشیا کے سفر میں ہم حال کے آئینہ میں جھانکیں گے اور مستقبل کے افق پر نظر ڈالیں گے۔

پہلا پڑاو

روسی انتونوف طیارے کے انجن کے شور میں جب ایر ہوسٹس نے اعلان کیا کہ ازبکستان ہوا ہولاری کی پرواز کچھ دیر بعد تاشقند میں اترنے والی ہے تو میں نیند سے جاگ اٹھا۔ لیکن یہ اعلان سن کر مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں کیونکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ رات ایک بجے جب میں ماسکو کے اندرون ملک پروازوں والے ہوائی اڈے "دوموا دے دووا" سے تاشقند کے لیے روانہ ہوا تھا تو یہ سابق سوویت یونین کی ایرلائنز ایروفلوٹ کا طیارہ تھا۔ ازبکستان ہوا ہولاری کا نام میں نے پہلی بار اب سنا جب یہ طیارہ ازبکستان کے دارالحکومت تاشقند میں اترنے والا ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ بیچ پرواز ایر لائنز کیسے بدل گئی؟

برابر کی نشست پر ایک نوجوان ازبک تاجر بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ اعلان ہوا ہے کہ یہ ازبکستان ہوا ہولاری کی پرواز ہے؟ اس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ہاں یہ صحیح ہے۔ ازبکستان نے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا اپنی الگ ایر لائنز قائم کی ہے۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے اور ازبکستان کی آزادی کے بعد یہ سب اتنی عجلت اور بد نظمی کے عالم میں ہوا کہ ایروفلوٹ کے ان طیاروں کو جو اس کے حصے میں آئے ان پر ایروفلوٹ کا نام مٹانے اور ازبکستان ایرویز کا نام تحریر کرنے کا بھی موقع نہیں ملا۔

ازبک تاجر کہہ رہا تھا کہ ازبکستان اور وسط ایشیا کی دوسری جمہوریاؤں کو اس

برق رفتاری سے آزادی ملی ہے کہ جیسے حالات نے ان پر یہ آزادی تھوپ دی ہو۔ چونکہ یہ آزادی انھیں لڑے بغیر اور جدوجہد کیے بغیر ملی ہے اس لیے ان جمہوریاؤں کے عوام اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔

ازبک تاجر کہہ رہا تھا کہ اس پورے علاقہ میں صرف آذر بائی جان کی جمہوریہ ایسی تھی جہاں عوام نے ماسکو کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور سوویت یونین سے علیحدگی کے لیے جانوں کی قربانی دی تھی اور واقعی اس ازبک تاجر کے کہنے پر مجھے یاد آیا کہ سابق سوویت یونین کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے میخائل گورباچوف کی حکومت نے جو ریفرنڈم کرایا تھا اس میں وسط ایشیا کی جمہوریاؤں نے بھاری اکثریت سے سوویت اتحاد کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ میرے ذہن میں اچانک یہ سوال اٹھا:

تو کیا وسط ایشیا کی جمہوریاؤں کی آزادی نعمت غیر مترقبہ ہے اور محض برائے نام ہے؟

میرے کانوں میں وسط ایشیا کے امور کے ماہر اور اسلام آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن دانی کی وہ بات گونجنے لگی جو انہوں نے ۹۲ء کے اوائل میں لندن میں ایک ملاقات میں کہی تھی۔

ان کا کہنا تھا "اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ علاقہ آزاد ہو گیا ہے' یہ علاقہ کھل گیا ہے لیکن یہ صرف کاغذ پر ہے کیونکہ جب تک ان کو باہر نکلنے کا موقع نہ ملے یہ آزادی برائے نام ہے۔ اب تک یہ لوگ ماسکو کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں۔ اب پہلی بار انہیں موقع ملے گا کہ وہ باہر نکلیں اور دنیا دیکھیں۔ گو کچھ لوگ باہر جا رہے ہیں لیکن بہت کم۔ گو کاغذ پر تو انھیں آزادی مل گئی ہے لیکن عملی طور پر نہیں۔"

اور پھر میں نے نیند کے دامن کو بالکل جھٹک کر سوچنا شروع کیا تو مجھے خود تعجب ہوا کہ لندن سے روانہ ہونے سے پہلے وسط ایشیا کی ان چار جمہوریاؤں کے لیے ویزا' سابق سوویت یونین کے سفارت خانے نے جاری کیا تھا جو اب روس کا سفارت خانہ ہے۔ یعنی آزادی کے بعد اب بھی آپ ماسکو کی اجازت کے بغیر ان جمہوریاؤں میں داخل نہیں ہو سکتے۔

ماسکو کے نام پر مجھے وہ تکلیف دہ سفر یاد آیا جو میں نے ماسکو کے بین اقوامی ہوائی اڈے "شری متوا" سے اندرون ملک کی پروازوں کے اڈے "دموا دے دووا" تک کیا تھا۔

شری متوا پر ڈالر خریدنے والے اور ٹیکسی ڈرائیور چیلوں کی طرح منڈلا رہے تھے۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور جس نے میرا گھیراؤ کر لیا تھا اور کسی طرح گھٹنے ٹیکنے کے لیے آمادہ نہیں تھا' غیر ملکی کرنسی بدلوانے کا بند کاونٹر دکھا کر مجھے ڈرانے میں کامیاب ہو گیا۔ سخت بھاؤ تاؤ اور کرایہ ڈالر میں وصولنے پر اصرار کے بعد ٹیکسی ڈرائیور ابھی ماسکو کے مضافات ہی میں تھا کہ اس کی ٹیکسی میں پٹرول ختم ہو گیا۔ اس نے وہیں بے بس ہو کر ہتھیار ڈال دیے کیونکہ اسے معلوم تھا کہ پٹرول کی اتنی سخت قلت ہے اور پٹرول کی لحہ بہ لحہ بڑھتی ہوئی قیمت کے پیش نظر' کھلے بازار میں پٹرول حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ مجھے بھی اخباروں کے ذریعہ اس بحران کا علم تھا لہذا میں نے بھی صورت حال سے مصالحت کرنے میں بہتری سمجھی۔

جیسے تیسے ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے "دو ماوے دووا" جانے والی بس میں سوار کرا دیا۔۔۔ جو ایسا لگتا تھا کہ یہ کبھی ختم نہ ہونے والے سفر پر رواں ہے۔ برف باری اور سڑک کی کیچڑ سے بس کے شیشے بری طرح سے کالے ہو گئے تھے اور اب کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ اندر مسافر سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ میں نے جب ان مسافروں پر ایک نظر دوڑائی تو مجھے انہیں دیکھ کر ہلکی سی جھرجھری آ گئی کہ پچھلے سال تک یہی ایک سپر طاقت کے شہری تھے۔

ان کے چہرے مضمحل' بے رونق اور بے جان تھے اور یہ ایک دوسرے سے بے زار اپنی اپنی فکروں میں گم تھے۔ بس میں سوار ہونے سے پہلے جو دھکم پیل ہوئی تھی اور ڈرائیور سے جو جھڑپیں ہوئی تھیں اس کے بعد یہ سب تھک کر چور ہو گئے تھے۔

مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے اپنے بیگ سے چاکلیٹ نکالی۔ میرے برابر بیٹھی ہوئی ایک ادھیڑ عمر کی خاتون نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہونے والا ہے۔ میں نے فوراً یہ چاکلیٹ ان کو پیش کر دی جسے بے چون و

چہ انھوں نے "اسپاسیبا بولشائی" یعنی بہت شکریہ کہہ کر قبول کر لیا اور اس میں سے آدھی کھا کر آدھی چاکلیٹ اپنے پرس میں رکھ لی۔ شاید اپنے میاں یا بچے کے لیے۔

میں پورے ۲۰ سال پہلے ماسکو آیا تھا۔ جب سقوط ڈھاکہ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو سوویت رہنماؤں سے ملنے آئے تھے۔ اس زمانے میں سوویت یونین کا زبردست دبدبہ تھا اور ماسکو میں گہما گہمی اپنے شباب پر تھی۔ ایسی بدحالی اور بدنظمی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس زمانے کے مقابلہ میں ماسکو بالکل بدل گیا تھا اور ماسکو والے بھی۔ ممکن ہے کہ میرا یہ احساس اس بنا پر ہو کہ سوویت یونین جس کا اس زمانے میں سارے جہاں میں ڈنکا بول رہا تھا اب بکھر چکا تھا۔ لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ اتنی بڑی نظریاتی مملکت آخر کیسے ریت کے قلعہ کی طرح ایک ہی لہر میں بہ گئی؟ تین گھنٹے تک سفر کے بعد جب میں ماسکو کے اندرون ملک پروازوں والے ہوائی اڈے "دوما دے دووا" پہنچا تو میرے ہوش اڑ گئے۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ میں غلط جگہ آ گیا ہوں۔ یہ کسی طور سے بھی ہوائی اڈا نہیں لگتا تھا بلکہ ایک بس اڈا معلوم ہوتا تھا۔ مسافروں کی اتنی بھیڑ کہ بس اللہ کی پناہ۔ لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ بنچیں مسافروں سے اٹی پڑی تھیں۔ کچھ لوگ سو رہے تھے کچھ اونگھ رہے تھے اور کچھ۔ دور چھت پر آویزاں بڑے سے ٹیلی ویژن سیٹ پر پروگرام دیکھ رہے تھے۔ باقی مسافر فرش پر اپنے سامان سے ٹیک لگائے یا ان پر براجمان اسی طرح وقت کاٹ رہے تھے جس طرح ہندوستان اور پاکستان میں ریلوے پلیٹ فارم پر مسافر ریل گاڑی کا انتظار کرتے ہیں۔ شور ایسا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا ہوائی اڈا ہے۔

دوما دے دووا سے جب میں تاشقند کی پرواز کے لیے ایرفلوٹ کے طیارے میں سوار ہوا تو ہوائی اڈے پر نہ تو کسی نے پاسپورٹ طلب کیا، نہ ویزا چیک کیا اور نہ کسٹمز کی جانچ پڑتال کے لیے سامان کھولا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں پرانے سوویت یونین میں اندرون ملک کی پرواز پر ہوں۔

ابھی میں اسی شش و پنج میں تھا کہ طیارہ تو آزاد ازبکستان کے دارالحکومت

تاشقند کے ہوائی اڈے پر اتر کر ایک جھٹکے کے ساتھ رک گیا اور طیارے میں ازبک موسیقی گونج اٹھی۔

طیارے سے اترتے ہی میں نے اپنا پاسپورٹ اور اس میں الگ رکھے ہوئے ویزا کے پہلے کارڈ کو سنبھالا کہ امیگریشن میں اس کی جانچ پڑتال ہو گی لیکن ایرفلوٹ کی لاری نے مسافروں کو ہوائی اڈے کی عمارت کی طرف لے جانے کے بجائے عمارت کے باہر پھاٹک پر اتار دیا جہاں ٹیکسیاں' کاریں اور بسیں کھڑی تھیں۔ یہاں نہ کوئی پاسپورٹ چیک کرنے والا تھا اور نہ کوئی کسٹمز والا۔ میری نظر اچانک ہوائی اڈے کی عمارت پر نصب گھڑی پر گئی - اس میں صبح کے پانچ بج رہے تھے جب کہ تاشقند میں سورج نکل چکا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے جب میں نے گھڑی دیکھی تو اس میں صبح کے سات بجے تھے۔ میں نے ٹیکسی والے سے پوچھا کہ کیا یہ صحیح وقت ہے تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر اس نے میرے اچنبھے کی وجہ بھانپ لی اور بتایا کہ ماسکو اور تاشقند کے وقت میں دو گھنٹے کا فرق ہے لیکن تاشقند کے ہوائی اڈے کی عمارت کی گھڑی میں وقت ماسکو کا ہی ہوتا ہے کیونکہ وسط ایشیا میں اب بھی تمام پروازیں' ماسکو کے وقت کے مطابق آتی اور جاتی ہیں۔

ازبکستان کو وسط ایشیا کی نو آزاد مسلم جمہوریاؤں میں کلیدی حیثیت اور اہمیت حاصل ہے۔

گو رقبہ اس کا ایک لاکھ ۵۸ ہزار مربع میل ہے لیکن آبادی دو کروڑ ہے جو دوسری تمام جمہوریاؤں سے زیادہ ہے۔ سابق سوویت یونین میں ازبک قوم۔ چوتھی بڑی قوم مانی جاتی تھی۔

ازبکوں کا سلسلہ' منگولوں کے ان خاندانوں سے ملتا ہے جنہوں نے نہ صرف وسط ایشیا بلکہ کیف تک روس پر قبضہ کر لیا تھا اور جو اس علاقہ کے فاتح تو تھے لیکن انہوں نے مفتوح علاقہ کے مذہب اسلام کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اسے اختیار کر لیا۔

ازبکستان میں اسلام آٹھویں صدی عیسوی میں امیہ دور میں آیا۔ عین اس زمانے میں جب محمد قاسم نے سندھ فتح کیا تھا' ایک اور عرب جرنیل قتیبہ بن مسلم' آمو دریا پار کر کے ازبکستان میں داخل ہوا تھا اور چین کی سرحد تک جا پہنچا۔ پھر نویں صدی میں یہاں سامانی سلطنت رہی جس کا علاقہ افغانستان میں ہرات تک اور ایران میں اصفہان تک پھیلا ہوا تھا۔

بارہویں صدی عیسوی میں تباہی اور بربادی اور قتل و غارت گری کے اس طویل طوفان کے بعد جو چنگیز خان اپنے ساتھ اس علاقہ میں لایا تھا' تیموری دور نے ازبکستان کو سنبھالا دیا اور نہ صرف اس کی سرحدیں ہندوستان تک پھیلا دیں بلکہ اس کی تہذیب اور ثقافت کو وہ رفعت بخشی جس کی جھلک سات سو سال کے بعد اب بھی سمرقند' بخارا اور خیوا کی حسین و جمیل اور عالی شان مساجد اور مدارس کی عمارتوں میں نمایاں ہے۔

ازبکستان کو نہ صرف اس بات پر ناز ہے کہ یہ تیمور اور بابر کا وطن ہے جن کے ذریعہ ازبکستان کے برصغیر کے ساتھ ان مٹ رشتے استوار ہوئے بلکہ اسے اس بات پر بھی فخر ہے کہ امام بخاری' بہاء الدین نقش بندی اور ترمذی ایسے مسلم عالم اس کی سرزمین سے اٹھے اور اس نے علی شیر نوائی ایسے شاعر' ابن سینا ایسے سائنس دان اور البیرونی اور فارابی ایسے مفکر پیدا کیے۔

لیکن یہ ستم ظریفی ہے کہ ازبکستان جو علم و دانش اور تہذیب و ثقافت کا گہوارہ تھا پچھلے ڈیڑھ سو سال سے زار روس اور اس کے بعد کمونسٹ نظام کے تسلط اور ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا۔

زار روس' پیٹر دی گریٹ نے ازبکستان اور وسط ایشیا کے دوسرے علاقوں پر حملہ محض اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ اس کے پس پشت' روس پر منگولوں اور تاتاریوں کے تسلط کے انتقام کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ چونکہ منگولوں اور تاتاریوں نے اسلام قبول کر لیا تھا لہٰذا روس کے زاروں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ انہیں ""ایشیائیوں"" یعنی مشرق سے آنے والے مسلمانوں نے زیر کیا تھا اور

ان کے دلوں میں انتقام کی آگ وراثت کی صورت میں ایک زار سے دوسرے زار میں منتقل ہوتی گئی۔

انتقام کی یہی آگ تھی جس نے سب سے پہلے سولہویں صدی میں روس میں "کازان" کے مسلم علاقے کو جلا کر راکھ کر دیا۔ "ایوان دی ٹیریبل" کی فوجوں نے کازان میں ڈیڑھ سو مساجد اور مدارس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس زمانے میں وہاں پچاس ہزار مسلمان ہلاک ہوئے اور جو بچ گئے ان کا مذہب بدلوا دیا گیا۔

پھر زار روس الگزانڈر کے زمانے میں ازبکستان میں جو ظلم و ستم توڑے گئے ان کی ہولناک داستانیں' سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں۔ الگزانڈر کے زمانے میں تاشقند میں اس کا وائسرائے جنرل کاف مین تھا جس نے ازبکوں کی مزاحمت کو کچلنے کے لیے ہزاروں ازبکوں کو سائبیریا میں جلاوطن کر دیا تھا اور جس شخص کی طرف سے بھی بغاوت کا اندیشہ ہوا اس کے گھر کو بارود سے اڑا دیا۔ ۱۹۱۶ء کی بغاوت کے دوران بتایا جاتا ہے کہ اس علاقہ میں دس لاکھ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کمیونسٹ انقلاب کے بعد امید تھی کہ اس علاقہ کو زار روس کے استحصالی دور سے نجات مل جائے گی لیکن یہ دور جہاں ایک طرف تعلیم' صحت اور دوسری بنیادی سہولتوں کی نوید لے کر آیا وہاں اس انقلاب نے اس علاقہ کے عوام کے مذہب' ان کی روایات اور ان کے طرز زندگی پر بھرپور وار کیا' مساجد تباہ کر دی گئیں یا انھیں سینما گھروں میں بدل دیا گیا۔ اسلامی مدرسے بند کر دیے گئے یا ان میں نائٹ کلب قائم کر دیے گئے۔ حج پر جانے کی پابندی عائد کر دی گئی اور قرآن پاک اور دوسری مذہبی کتابیں نذر آتش کر دی گئیں۔

بہرحال ستر سال کا یہ طویل دور بھی' ۱۹۹۱ء کے آخر میں ختم ہو گیا جب سویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد وسط ایشیا کی دوسری جمہوریاؤں کے ساتھ ازبکستان بھی آزاد ہوا۔

پتھروں کا شہر

لندن سے میں جمعہ کے روز علی الصبح روانہ ہوا تھا اور پورے ۲۴ گھنٹے کے متواتر سفر کے بعد ازبکستان کے دارالحکومت تاشقند پہنچا۔ فروری کے آخری دن کے سورج کی کرنوں کی تمازت کے سامنے کئی مہینوں سے جمی ہوئی برف پسپا ہو رہی تھی۔۔ میں نے اس اجنبی سرزمین پر زندگی میں پہلی بار قدم رکھا تھا لیکن اس شہر کی فضا میں مجھے بے پناہ اپنائیت محسوس ہوئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ برصغیر کی عصری تاریخ میں تاشقند جانا پہچانا شہر ہے۔

بھارت اور پاکستان کے درمیان ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد اسی شہر میں اس زمانے کے سوویت وزیر اعظم کوسی گن کی کوششوں سے ایوب خان اور لال بہادر شاستری کے مابین وہ سمجھوتا طے پایا تھا جو تاشقند سمجھوتا کہلاتا ہے۔۔۔ پھر اسی سمجھوتے کے فوراً بعد یہیں لال بہادر شاستری اس دنیا سے چل بسے تھے۔

میرے ذہن میں شیریں فرہاد کی داستان سے وابستہ سرزمین کے اس شہر تاشقند کا نقشہ، پتلی پتلی گلیوں، اطلس و کم خواب اور قالینوں سے بھرے بازاروں اور دروں اور محرابوں والی خوبصورت حویلیوں والے پراسرار رومانی شہر کا تھا کیونکہ سنا اور پڑھا تھا کہ یہ شہر جو "تیین شین" یعنی جنت کے پہاڑوں کے دامن میں دریائے "چرچک" کی وادی میں بسا ہوا ہے دو ہزار سال پرانا ہے۔۔۔ اور ایک زمانے میں یہ ایک ہزار قلعوں کا شہر کہلاتا تھا۔۔۔ غالباً اسی مناسبت سے اس کا نام تاشقند ہے یعنی پتھروں کا

شہر--- ازبک زبان میں تاش' پتھر کو اور قند' شہر کو کہتے ہیں-

لیکن جب جدید ترین' بلند و بالا اور عالی شان عمارتیں' شجردار کشادہ شاہراہیں' فواروں والے چوراہے اور جا بہ جا پارک دیکھے تو اس شہر کی وسعت اور کشادگی نے مجھے حیرت میں ڈال دیا-

تاشقند کی اس وسعت اور کشادگی کا راز عین شہر کے بیچ میں "حوصلہ" کے نام سے اس یادگار سے کھل گیا جو ۲۶ اپریل ۶۶ء کے ہولناک زلزلہ کے مرکز پر تعمیر کی گئی ہے- اس زلزلے سے شہر میں زبردست تباہی آئی تھی اور بہت سی صدیوں پرانی عمارتیں مسمار ہو گئی تھیں- لیکن تاشقند والوں کا کہنا ہے کہ اس زلزلہ کے بہانے' ماسکو کی حکومت نے قدیم شہر کے تمام آثار مٹا دیے اور شہر کے وسط سے پرانی آبادی کو مضافات میں منتقل کر دیا' یوں نہ صرف شہر کا نقشہ بدل دیا بلکہ سابق سوویت یونین کے دوسرے علاقوں سے روسیوں' یوکرینوں اور آرمینائیوں کو لا کر یہاں بسا دیا اور شہر کی آبادی کی ہیئت تبدیل کر دی-

لیکن پھر بھی تاشقند والوں کو اپنے شہر پر ناز ہے کہ یہ سابق سوویت یونین کے تین بڑے شہروں--- ماسکو' لینن گراڈ اور کیف کے بعد چوتھا بڑا شہر ہے اور ایشیا کا پہلا شہر ہے جہاں زیر زمین ریلوے شروع ہوئی جس کے اسٹیشن سنگ مرمر سے یوں بنائے گئے ہیں کہ ان پر زلزلہ کا اثر نہیں ہو سکتا اور اندر خوبصورت اور کشادہ پلیٹ فارموں پر جھاڑ فانوس آویزاں ہیں-

------

دو ہزار سال پرانے اس شہر کی فضا میں پہنچتے ہی نہ جانے کیوں دل اور دماغ اس کی تاریخ کے جھروکوں میں جانے کے لیے تڑپ اٹھا لیکن میں کہ ٹھہرا اجنبی---
بہرحال--- دیئے سے دیا جلتا ہے-

وسط ایشیا کے سفر پر روانگی سے قبل پاکستان کے ممتاز ماہر لسانیات اور وسط ایشیا کے امور کے ماہر' فتح علی ہاشم سے لندن میں ملاقات ہوئی تھی جو ایشیائی امور کی رائل

سوسائٹی کی سالانہ ضیافت میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ میں نے جب ان سے ذکر کیا کہ میرا ارادہ وسط ایشیا کے سفر پر جانے کا ہے تو انھوں نے کہا کہ میں تاشقند میں عباس خان سے ضرور ملوں جن کا تعلق پاکستان سے ہے اور جو ایک عرصہ سے تاشقند میں رہتے ہیں۔ عباس خان انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سوویت یونین گئے تھے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔۔۔ پہلے تاشقند ریڈیو کی اردو نشریات کے کرتا دھرتا تھے اور اب پاکستان کے ایک تجارتی ادارے تاپانی کارپوریشن سے منسلک ہیں جو گذشتہ ۲۳ برس سے سوویت یونین میں کاروبار کر رہا ہے۔

اور واقعی اس اجنبی تاشقند میں عباس خان ایک جادوئی کلید ثابت ہوئے کہ جن کے نام سے تمام مقفل دروازے اپنے آپ کھلتے چلے گئے۔ ان کا حلقہ بہت وسیع ہے اور بیشتر اس میں اردو داں ازبک ہیں۔ انھوں نے تاشقند کے ممتاز صحافی دادا خاں نوری سے ملاقات کرائی جو اردو کے رسیا ہیں اور حال ہی میں ایک وفد کے ساتھ پاکستان کا دورہ کر کے لوٹے ہیں۔ عباس خاں کے توسط سے ایک روسی طالبہ' تامیلا تکلنا سے بھی ملاقات ہوئی جو تاشقند یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز میں اردو پڑھ رہی ہیں۔ ان کے والد اور والدہ دونوں اردو داں ہیں۔ والد بنگلہ دیش میں روسی سفارت خانہ کے شعبے اطلاعات کے سربراہ رہ چکے ہیں اور والدہ ماسکو میں اردو پڑھاتی ہیں۔ تامیلا نے جس بے باک انداز سے اپنے اردو کے استاد' ڈاکٹر خال مرزا سیف تاش مرزا سے ملوایا اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اپنے استاد کی عزت اور توقیر کی یہ ایسی مثال تھی جو وسط ایشیا کی قدیم تہذیب سے عبارت ہے۔ یقیناً اس جذبہ کے پیچھے اردو سے محبت بھی عیاں تھی۔

ڈاکٹر تاش مرزا کا رشتہ' برصغیر سے اردو کے ناتے بڑا گہرا ہے۔ یہ ایک عرصہ کراچی میں پاک سوویت دوستی کے ادارے۔۔۔۔ ایوان دوستی کے سربراہ بھی رہ چکے ہیں اور آج کل یہ ازبکستان پاکستان سوسائٹی کے نائب صدر ہیں۔

ڈاکٹر تاش مرزا مجھ سے ملتے ہی بھانپ گئے کہ میں ان تاریخی رشتوں کے تانوں بانوں کو جاننے کا خواہاں ہوں جو وسط ایشیا اور خاص طور پر ازبکستان اور برصغیر کی

تہذیب اور ثقافت کو قریب تر لائے ہیں۔

ڈاکٹر تاش مرزا کہہ رہے تھے کہ مغلوں کے زمانے سے پہلے ہی سے یہاں کا تہذیبی اور ثقافتی اثر' برصغیر پر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ غالباً یہ سلسلہ بارھویں یا تیرھویں صدی سے شروع ہوا لیکن شباب پر تو یہ اپنے بابر کے زمانے سے شروع ہوتا ہے اور ایک آصف صاحب بہت ہی قابل غور بات ہے کہ جب وہ یہاں سے گئے تھے تو وہ عربی جانتے تھے۔ فارسی جانتے تھے جو شرفا کی اور سرکاری زبان تھی اور گھروں میں اپنی چغتائی زبان بولتے تھے۔۔۔ بابر نے تو وہاں اپنے وطن سے بہت دور رہتے ہوئے بہترین غزلیں لکھی ہیں جو آج ہمارے ادب کا شاہکار ہیں۔۔۔ یہ عجب بات ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں بابر تو صرف ایک بادشاہ کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں' ہم بابر کو زیادہ ایک عالم اور شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں' تیسرے نمبر پر ان کی بادشاہت آتی ہے۔۔۔ پھر بابر کی اولاد ذولسانی ہو گئی وہ مقامی زبان بھی کچھ بول لیتے تھے اور اپنی ترکی زبان بھی۔ تیسری اور چوتھی نسل ان کی آئی تو وہ اپنی زبان بالکل بھول گئی۔ لیکن اس نے اپنا رسم و رواج یہاں سنٹرل ایشیا کا برقرار رکھا۔

میں نے ان سے کہا کہ آپ نے تیمور کا ذکر نہیں کیا۔

ڈاکٹر تاش مرزا کہنے لگے کہ تیمور کا اثر ہمارے ان رشتوں پر شاید کوئی خاص نہیں ہوا تھا۔ البتہ تیمور کی جو اتنی وسیع و عریض سلطنت بنی تھی لیکن ہمارے ان ثقافتی اور تہذیبی رشتوں پر اس کا اتنا اثر نہیں ہوا جتنا کہ بابر اور مغلوں کے زمانے میں ہوا۔

اچانک میرے ذہن میں یہ سوال اٹھا کہ کیا وسط ایشیا کے لوگ بابر سے اس بات پر ناراض نہیں کہ انہوں نے اس سرزمین کو بالکل ترک کر دیا اور وہ ہندوستان فتح کرنے کے بعد وطن واپس نہیں آئے؟

ڈاکٹر تاش مرزا نے جواب دیا: "واقعی میں سمجھتا ہوں یہ بابر کا المیہ تھا۔ یہ ان کی سب سے بڑی ٹریجڈی تھی۔ آپ اگر بابر کے کلام کو پڑھیں تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ وہ اپنے وطن کو کتنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے وطن سے بے حد محبت تھی۔

اگر ہر غزل میں نہیں تو بیشتر غزلوں میں اس محبت کی اور اس تشنگی کی عکاسی ملتی ہے۔ ہاں یہ بات کہ وہ یہاں واپس کیوں نہیں آئے، شاید اس کو جاننا اور سمجھنا بڑا مشکل ہے۔"

میں نے کہا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں اتنی کشش تھی کہ وہ واپس نہ آ سکے۔

ڈاکٹر تاش مرزا نے کہا جی ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی مٹی میں اتنی کشش تھی۔ ہاں آصف صاحب مجھے یاد آیا۔ ان کا ایک مصرع ہے آدھا اردو میں اور آدھا ترکی میں ہے۔ بابر کہتے ہیں کہ مجھے کچھ نہیں چاہیے سوائے پانی اور روٹی کے ---- پانی اور روٹی یہ دو الفاظ ہیں اس مصرع میں باقی سارے ترکی میں ہیں۔ کہتے ہیں کہ مجھے کچھ نہیں چاہیے صرف پانی اور روٹی ---- یعنی اس کا مطلب ہے کہ وہاں واقعی بابر کا دل بھی لگ گیا اور شاید ماحول بھی راس آ گیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ وطن سے جدائی شدت سے محسوس کرتے تھے۔

ڈاکٹر تاش مرزا اس قدر روانی سے اور اس پیارے انداز سے اردو میں گویا تھے کہ جیسے یہ ان کی اپنی مادری زبان ہو ---- میں نے کہا کہ باقی باتیں بعد میں ہوں گی پہلے یہ بتائیے کہ اردو سے آپ کو دل چسپی کب اور کیسے شروع ہوئی؟

ڈاکٹر تاش مرزا بولے: دل چسپی تو اب میں سوچتا ہوں تو بہت معمولی تھی۔ میں یہاں تاشقند میں دوسرے شہر سے آیا تھا داخلہ لینے کے لیے۔ میں بالکل دوسرے انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ میں پولیٹیکل انسٹی ٹیوٹ میں آیا تھا اور فیکلٹی آف انرجی میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ تو میں جا رہا تھا اس شعبہ میں کہ راستے میں اردو کا شعبہ پڑا۔ وہاں ایک نہایت خوبصورت خاتون تھیں انہوں نے کہا کہ اگر آپ اردو کے شعبہ میں داخلہ لیں تو ہم آپ کو بہت سی سہولتیں فراہم کریں گے۔ انہوں نے اتنی تعریف کی ہندوستان اور پاکستان کی اس زمانے میں تو میں سمجھا کہ بس میں بادشاہ ہو گیا ہوں اور میری قسمت اسی وقت وہیں حل ہو گئی۔"

وسط ایشیا اور برصغیر کے پرانے رشتوں کے موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے میں نے ڈاکٹر تاش مرزا سے سوال کیا کہ کیا مغلوں کے آخری دور میں وسط ایشیا کے

برصغیر کے ساتھ رشتے کم نہیں ہو گئے تھے؟

ڈاکٹر تاش مرزا نے کہا مغلوں کے آخری دور میں جی ہاں یہ رشتے کم ہو گئے تھے لیکن اس علاقے سے شاید اتنی بڑی تعداد میں لوگ برصغیر گئے تھے کہ ان کا صدیوں تک اثر وہاں رہا۔ ایک بار میں حیدر آباد دکن گیا تھا۔ وہاں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سنٹرل ایشیا کے بہت سے الفاظ۔ دکنی زبان میں اب بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اردو میں یہ الفاظ اب مستعمل نہیں لیکن دکن کی اردو میں اب بھی محفوظ ہیں۔ سنٹرل ایشیا کا اثر دکن تک پھیلا تھا اور اس کے آثار اب بھی وہاں موجود ہیں۔۔۔۔ ہاں اب دیکھیے ہندوستان اور پاکستان میں لوگ اپنے آپ کو چغتائی کہلاتے ہیں۔ جیسے عصمت چغتائی وغیرہ۔ ان سے اگر پوچھیں کہ چغتائی کا کیا مطلب ہے تو وہ نہیں بتا سکیں گے۔ یا پھر جیسے برصغیر میں بہت سے لوگ اپنے آپ کو قزلباش کہتے ہیں۔ ان سے پوچھئے کہ قزلباش کا مطلب کیا ہے وہ جانتے نہیں۔۔۔ قزلباش ترکی زبان میں انھیں کہتے تھے جن کے بال لال ہوتے تھے۔ ان کا ایک قبیلہ تھا یا فوج تھی لال بال والے لوگوں کی۔ جنہیں قزلباش کہا جاتا تھا۔۔۔ بہت سے ایسے الفاظ اور نام ہیں جو سنٹرل ایشیا کے ہیں جو ہندوستان اور پاکستان میں اپنا لیے گئے ہیں۔ اب یہ لفظ ہی لیجئے۔۔۔بیگم۔۔۔ بیگ کا مطلب ہے شریف آدمی' پیسے والا اور اہل دانش۔ ترکی میں "ام" کا مطلب ہے میرا۔۔۔ بیگم یعنی میرا بیگ۔ تو دیکھیے سنٹرل ایشیا کے لوگ خواتین کی کتنی عزت کرتے تھے۔ خاتون خانہ کو میرا بیگ کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ یوں بیوی کا نام بیگم ہو گیا۔

میں نے تاش مرزا صاحب سے کہا کہ امیر خسرو بھی وسط ایشیا اور برصغیر کے درمیان زنجیر کی اہم کڑی ہیں۔

ڈاکٹر تاش مرزا نے مجھ سے اتفاق کیا اور کہا کہ جی ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ امیر خسرو کی بڑی دین ہے' کردار ہے ان کا اس زمانے میں برصغیر اور وسط ایشیا کی ادبی روایات کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں۔ انہوں نے بلاشبہ بیش قیمت کردار ادا کیا ہے۔ ادب اور تہذیب کے حوالے سے یہ بہترین نمونہ ہے جو ہمیں ملتا ہے۔ مرزا

غالب خود فخر کرتے تھے کہ ان کے آباو اجداد وسط ایشیا سے تعلق رکھتے تھے۔۔

ڈاکٹر تاش مرزا کی ان باتوں سے اب یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ تاشقند کی زمین پر قدم رکھتے ہی آخر میں نے یہاں بے انتہا اپنایت کیوں محسوس کی؟ سچ تو یہ ہے کہ ان سے ملاقات کے بعد یہ اپنایت اور بڑھ گئی اور وسط ایشیا کے اس پورے سفر میں میں نے اپنے آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی اجنبی نہیں محسوس کیا۔

غالب محلّہ

تاشقند کے اردو داں صحافی دادا خاں نوری مجھے شہر کا وہ محلّہ دکھانے کے لیے بے
تاب تھے جو مرزا اسد اللہ خاں غالب سے موسوم ہے اور مرزا غالب محلّہ کہلاتا
ہے۔۔ اسی محلّہ میں غالب کے نام پر ایک نئی مسجد بھی تعمیر ہو رہی ہے۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

بادہ خوار غالب کے نام پر مسجد تعمیر کر کے غالباً ازبکستان کے لوگ غالب سے عقیدت
. اظہار کے ساتھ ساتھ انھیں ثواب جاریہ بھی پہنچانا چاہتے ہیں۔ اصل میں تاشقند والوں
مرزا غالب کی یہ بات بے پناہ بھائی ہے کہ وہ بڑے فخر سے اپنے آپ کو ازبک کہتے تھے۔
دلی میں' جہاں غالب نے آنکھ کھولی اور ساری زندگی تگ و دو اور مشق سخن میں بتا دی'
ید ان کے نام پر نہ تو کوئی سڑک ہے اور نہ کوئی محلّہ اور ادھر پاکستان میں جہاں اردو داں
ے اٹھتے بیٹھتے غالب کے شعر پڑھتے اور سر دھنتے ہیں' اگر میں غلط نہیں تو کہیں بھی نہ تو
ب کے نام پر کوئی گلی ہے نہ کوئی کوچہ ہے اور نہ کوئی بستی۔
اتوار کا دن تھا' دادا خاں نوری نے صبح سویرے ٹیلی فون کیا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ مرزا
ب محلّہ لے جائیں گے اور بس دس منٹ میں ہوٹل پہنچا چاہتے ہیں۔ دس منٹ کی جگہ
بہ گھنٹا گزر گیا۔ مجھے انتظار کی تاب نہ رہی اور جیسے ہی میں ہوٹل سے باہر نکلا تو دیکھا
! خاں نوری ہانپتے کانپتے" اردو کی روسی طالبہ تاسیلا کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ سخت

سردی میں بھی وہ پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ چوڑی باڑھ والی فر کی ٹوپی' جسے وہ بہت کم اتارتے تھے' ان کے ہاتھ میں تھی اور چہرہ ندامت کے احساس سے گہنایا ہوا تھا۔ کہنے لگے کہ آنے میں تاخیر' پٹرول کے شدید بحران کی وجہ سے ہوئی۔ شہر میں کہیں بھی پٹرول دستیاب نہیں--- بڑی مشکل سے چور بازار سے پٹرول ملا ہے۔

دادا خان نوری نے بتایا کہ سوویت یونین کے ٹوٹنے اور آزادی سے پہلے پٹرول کے دام ۲۰ کوپیک فی لیٹر تھے۔ ایک روبل میں ایک سو کوپیک ہوتے ہیں۔

دادا خان نوری کہہ رہے تھے "پٹرول پہلے ۲۰ کوپیک تھا۔ اس کے بعد دو ماہ پہلے چالیس کوپیک ہوا۔ پھر دو روبل فی لیٹر ہوا۔ آج چھ روبل فی لیٹر ہے۔ میرے ایک دوست جو ایک سرکاری ادارے میں کام کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ پٹرول کی قیمت ایک دو ہفتہ بعد بارہ روبل فی لیٹر ہو جائے گی۔

دادا خان نوری نے ہوٹل کے سامنے کشادہ شاہراہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ دیکھیے پٹرول کی شدید قلت کی وجہ سے لوگوں نے کاریں چلانا بند کر دی ہیں اور واقعی سڑک پر بہت کم کاریں نظر آ رہی تھیں۔ اکا دکا آ جا رہی تھیں اور انھیں بھی لوگ راستے میں روک کر ٹیکسیوں کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔

دادا خان نوری کو وہ زمانہ یاد آ گیا جب خروشیف کے دور میں حکومت نے دیہات میں گدھوں پر ٹیکس عائد کیا تھا۔ ایک گدھے کے دام اس وقت پچاس روبل تھے لیکن ٹیکس ان پر ایک سو روبل فی گدھا لگایا گیا تھا۔

لوگوں نے اس ٹیکس سے تنگ آ کر اپنے سارے گدھے سڑکوں پر چھوڑ دیے۔ کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ دادا خان نوری کہہ رہے تھے کہ ایسا لگتا ہے کہ بہت جلد وہ زمانہ آنے والا ہے جب سب لوگ اپنی کاریں سڑکوں پر چھوڑ دیں گے گدھوں کی طرح۔

یہ حقیقت ہے یا محض لطیفہ۔ میں اس میں بالکل تمیز نہیں کر سکا۔

مرزا غالب محلّہ' تاشقند یونیورسٹی کے قریب ایک نہایت کشادہ اور خوبصورت علاقے

میں واقع ہے۔ ایک چوڑی چکلی' صاف شفاف شاہراہ' جس کے دونوں جانب پھلوں کے درخت لگے ہوئے ہیں' اس محلّے میں لے جاتی ہے۔ اس شاہراہ کا نام بھی مرزا اسد اللہ خاں غالب سے موسوم ہے۔

مرزا غالب محلّے سے ملحق دو اور محلّے ہیں۔ ایک البیرونی محلّہ اور دوسرا ابراہیم محلّہ۔ زیر تعمیر مسجد انہی تین محلوں کے لیے مشترکہ مسجد ہے۔ یہاں البیرونی محلّہ کے رئیس سعید بی خواجہ سعید کرم اغلو تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اس مسجد کی تعمیر ازبکستان کی آزادی کے بعد شروع ہوئی ہے جب کہ یہاں اسلامی جذبہ نئے انداز سے موجزن ہوا ہے۔

رئیس سعید بی خواجہ کہہ رہے تھے کہ یہ مسجد تینوں محلوں میں رہنے والے بیس ہزار افراد کے لیے تعمیر کی جا رہی ہے۔ اس میں اردو کا ایک مدرسہ بھی قائم کیا جائے گا۔۔ ازبکستان کی حکومت نے اس مسجد کی تعمیر کے لیے کوئی امداد نہیں دی کیونکہ آزادی کے بعد بڑی تعداد میں نئی مساجد تعمیر ہو رہی ہیں اور حکومت کے لیے ان سب کو مالی امداد دینا مشکل ہے۔ البتہ اس غالب مسجد کے لیے پاکستان اور سعودی عرب نے مالی امداد دی ہے اور وسط ایشیا کے مسلم بورڈ نے بھی رقم دی ہے۔ اس کے علاوہ ان تینوں محلوں کے لوگ اپنے طور پر بھی چندہ جمع کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ مسجد اس سال کے آخر تک مکمل ہو جائے گی۔ البیرونی محلّے کے رئیس کا کہنا ہے کہ اس کی تعمیر میں دیر ایک تو تعمیراتی سامان کی قیمتوں میں کئی گنا اضافے کی وجہ سے ہوئی ہے دوسرے اس مسجد کے لیے غیر ممالک سے جو رقم آئی تھی وہ پرانے دستور کے مطابق ماسکو منتقل کر دی گئی تھی جہاں روسی حکومت نے اسے منجمد کر دیا۔۔۔اور اب واپس دینے سے انکاری ہے۔

ابھی ہم زیر تعمیر مرزا غالب مسجد دیکھ رہے تھے کہ غالب محلّہ کے رئیس عبیداللہ جان وہاں آ گئے اور ہم سب کو اپنے گھر لے گئے۔ باہر سے ان کا گھر بھی اس محلّہ کے دوسرے مکانات کی طرح تھا۔ اونچی دیوار اور ایک بڑا پھاٹک جس پر انگور کی بیلوں کے لیے لوہے کے فریم کا ایک چھجا لگا ہوا تھا۔ باہر سے مکان بالکل سادہ دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن جیسے ہی ہم پھاٹک سے مکان کے اندر داخل ہوئے' سامنے خوبصورت باغ نظر آیا جس میں سیب' ناشپاتی' بادام اور خوبانی کے پیڑ بہار کے انتظار میں کھڑے تھے۔

باغ کے تین جانب چوبی ستونوں والے کشادہ پختہ والان تھے اور ان سے ملحق بڑے بڑے کمرے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی پورا خاندان جمع ہو گیا' بیوی' بچے' بہو' داماد' پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں سب ایسے خوش کہ جیسے انھیں ہمارا شدید انتظار تھا کہ ہم کوئی خوش خبری لے کر آئے ہیں۔ نہایت پرتپاک انداز سے خیر مقدم کیا۔

رئیس محلّہ ہمیں والان کے پہلے کمرے میں لے گئے جو مہمان خانہ نظر آتا تھا' بالکل ویسے ہی جیسے ہندوستان اور پاکستان کے پرانے گھروں میں دیوان خانہ ہوتا ہے۔ اس کمرے کی دیواروں پر نہایت خوبصورت اور قیمتی قالین اور کڑھی ہوئی رنگین چادریں' جنھیں ازبک زبان میں "سوزنی" کہتے ہیں' آویزاں تھیں۔ چھت پر بے حد پیارے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ مہمان خانہ کے بیچ میں ایک لمبی سی میز پر سفید دستر خوان بچھا ہوا تھا اور اس پر خشک میوہ اور مختلف اقسام کے گوشت کے گول گول پرت اور گھوڑے کے گوشت کے مسالے لگے ہوئے "سا جس" تشتریوں میں رکھے تھے۔ ان کے ساتھ بڑے بڑے گول نان تھے۔

میز کے دونوں طرف چلی چلی بنچیں بچھی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی ہم ان بنچوں پر بیٹھے' رئیس محلّہ نے دعا کے لیے اپنے ہاتھ اٹھائے۔ ازبکوں کی رسم ہے کہ جب بھی کوئی مہمان ان کے گھر آتا ہے اور کھانے کی میز پر بیٹھتا ہے' میزبان دعا مانگتا ہے اور اللہ کا شکر بجا لاتا ہے کہ اس کے گھر مہمان آیا اور اس کے ساتھ اللہ کی برکتیں بھی۔

اس کے بعد رئیس محلّہ نے بڑے سے ایک نان میں سے ٹکڑے توڑ توڑ کر ہمارے سامنے رکھے۔ یہ بات مجھے عجیب لگی۔ لیکن یہ ازبکوں کی خاطر تواضع کا خاص انداز ہے۔ وہ خود مہمانوں کو روٹی توڑ کر دیتے ہیں۔۔۔ پھر رئیس محلّہ نے خوبصورت چائے دانی میں بغیر دودھ والی چائے جس کا رنگ ہلکا سا ارغوانی تھا' چھوٹے چھوٹے پیالوں میں ڈال کر بڑے احترام سے اپنا بایاں ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے ہوئے پیش کی۔۔۔ سامنے' بادام ایسی سفیدہ لگی ہوئی خوبانی کی گٹھلیاں رکھی تھیں جن کے سرے' بھاڑ میں بھننے سے ہلکے کھل گئے تھے۔ رئیس محلّہ نے بڑی چابک دستی سے گٹھلی کے ایک ٹوٹے ہوئے ٹکڑے کو کھلے ہوئے سرے میں ڈال کر گٹھلی کو کھٹ سے یوں کھولا کہ خستہ گری ثابت نکل آئی۔۔۔ انہوں نے مجھے کھانے کو دی۔ مزہ اس کا بالکل بادام کا سا تھا۔

ابھی چائے ختم نہیں ہوئی تھی کہ رئیس کی بیگم جو ہمارے ساتھ دستر خوان پر بیٹھنے کے بجائے دروازے میں کھڑی تھیں' ایک بڑی سی سینی میں شوربے سے بھرے ہوئے بڑے بڑے پیالے لے آئیں۔ یہ اصل میں یخنی تھی جس میں گوشت بھی تھا۔ آلو اور دوسری سبزیاں بھی اور چنے بھی پڑے ہوئے تھے--- شوربے کے فوراً بعد پلاؤ آیا جو ازبکستان' کیا بلکہ پورے وسط ایشیا کا مقبول ترین خوان ہے۔

ابھی ہم پلاؤ سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ پھاٹک پر دستک ہوئی۔ معلوم ہوا کہ محلّہ میں ایک شادی ہو رہی ہے اور رئیس کو لے جانے کے لیے لڑکی والوں کے ہاں سے لوگ آئے ہیں -- رئیس محلّہ نے ہم سے کہا کہ شادی میں ہمارا بھی بلاوا آیا ہے--- کیونکہ یہ رسم ہے کہ شادی کے وقت محلّہ میں جو بھی آتا ہے یا جو بھی محلّہ سے گزرتا ہے' وہ شادی کی ضیافت میں ضرور مدعو ہوتا ہے--- میں نے داوا خان نوری سے کان میں کہا کہ اگر رئیس کو علم تھا کہ محلّہ میں شادی ہے اور وہ ہمیں شادی میں لے جائیں گے تو پھر اپنے ہاں کھانے کا کیوں اہتمام کیا؟ داوا خان نوری نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ازبک کے ہاں جو بھی مہمان آتا ہے وہ کھانا کھائے بغیر نہیں جا سکتا۔

شادی دو گلیاں چھوڑ کر' ایک مشہور تاریخ داں قربانوف کے گھر میں تھی۔ نکاح ہو چکا تھا اور ضیافت جاری تھی۔ مکان کے باہر لڑکی والے میزبان' دو رویہ کھڑے تھے اور ہر آنے والے مہمان سے ہاتھ ملا کر اس کا استقبال کر رہے تھے۔

مکان کے اندر باغ میں مہمانوں کے لیے کھانے کی لمبی لمبی میزیں سجی ہوئی تھیں اور مہمان شوربے اور پلاؤ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ لیکن یہ سب مرد تھے' آس پاس کہیں کوئی خاتون نظر نہیں آتی تھیں--- ایک طرف تخت بچھا ہوا تھا جس پر دو موسیقار' رباب پر اورنگ زیب کی صاحبزادی' شہزادی زیب النساء کی ایک غزل گا رہے تھے--- اس وقت باغ میں مجھے ایک طلسماتی سماں محسوس ہوا۔

باغ کے ایک کونے میں اینٹوں کے چولھے پر بڑی سی ایک دیگ چڑھی ہوئی تھی اور ایک پہلوان نما باورچی' دیگ سے پلاؤ نکال رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کتنے آدمیوں

کے لیے پلاؤ تیار ہوا ہے؟۔۔ "قریب پانچ سو آدمیوں کے لیے" اس نے جواب دیا۔ میں نے پوچھا کہ پلاؤ میں کیا کیا پڑا ہے؟ اس نے کہا' پیاز'، گوشت' چاول' اور "نقل" یعنی کشمش اور بادام وغیرہ۔ پانچ سو آدمیوں کے لیے پلاؤ میں چاول کتنے ڈالے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ باورچی نے جواب دیا۔ ۲۵ کلو اور گوشت کتنا؟ گوشت بھی ۲۵ کلو۔ میں نے پوچھا کہ پلاؤ گھی میں تیار ہوا ہے یا تیل میں؟۔۔۔باورچی نے بتایا کہ اس میں بھیڑ اور کپاس کی "یوغ" یعنی چربی پڑی ہے۔۔ اور پلاؤ تیار کرنے میں کتنی دیر لگی؟ میں نے پوچھا۔۔۔ چار گھنٹے۔۔ اور یہ کتنی جلد ختم ہو جائے گا۔ باورچی نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔۔ دو گھنٹے میں اور اگر آدمی زیادہ آگئے تو آدھے گھنٹے میں۔

باغ کے علاوہ مکان کے دالان اور کمروں میں بھی مہمانوں کی خاطر تواضع ہو رہی تھی۔۔ ان میں ازبکستان کے ایک بزرگ سیاست دان نورالدین اکر موویچ محی الدین بھی تھے جو خروشیف کے زمانے میں ازبکستان کی کمونسٹ پارٹی کے سربراہ تھے۔ تاشقند میں ۱۹۶۶ء میں ایوب خان اور لال بہادر شاستری کے درمیان جو ملاقات ہوئی تھی اس میں بھی یہ شریک تھے اور خروشیف کے ساتھ ہندوستان اور افغانستان بھی جا چکے تھے۔

داداخان نوری نے جب ان سے میرا تعارف کرایا تو میں نے نور الدین اکر موویچ محی الدین سے پوچھا کہ آج کل ان کی کیا مصروفیات ہیں تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آج تو میں آپ کے ساتھ اس شادی میں شریک ہوں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ازبکستان کو جو آزادی ملی ہے اور یہاں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان کے بارے میں وہ کیا سوچتے ہیں؟

نورالدین اکر موویچ نے جواب دیا کہ یہ ازبکستان کے لیے ایک تاریخی مرحلہ ہے ۔ یہ آزادی ہماری جدوجہد کا ایک مرحلہ ہے جس کی لوگوں کو ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے خواہش تھی۔۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ایک کمونسٹ کی حیثیت سے وہ کیا سوچتے ہیں کہ کمونزم کیوں ناکام رہا؟ انہوں نے کہا "کمونزم کا اصل مقصد ہر قوم کی آزادی اور اس کے حقوق حاصل کرنا تھا لیکن افسوس کہ کمونسٹ قیادت یہ مقصد

حاصل نہ کر پائی کیونکہ کمونسٹ قیادت اپنی مفاد پرستانہ سیاست میں الجھ گئی اور کمونزم کے اصل مقصد کو اس نے ترک کر دیا۔"

ابھی سابق کمونسٹ رہنما سے بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ اعلان ہوا کہ مہمان رخصت ہو رہے ہیں۔ میزبانوں نے لڑکے والوں کو روئی بھرے لمبے لمبے روایتی ازبکی کوٹ پہنائے اور ایک بزرگ نے باآواز بلند دعا مانگی۔

جب یہ بزرگ دعا مانگ رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ واقعی کس اعلیٰ ہمتی سے ازبکوں نے اپنے مذہب' اپنی روایات اور اپنی تہذیب کو برقرار رکھا ہے حالانکہ یہ نصف صدی تک زار روس کے زیر تسلط رہے اور پھر گزشتہ ستر برس سے کمونسٹ نظام کے تحت تھے۔

میرے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ آخر کیسے ان ازبکوں نے ان دو استبدادی ادوار میں اپنی زبان' اپنی مذہبی قدروں اور اپنی روایات اور تہذیب کی جڑوں کو مضبوطی سے قائم رکھا؟

باب ۵

ازبک تہذیب نئے نرغے میں

تاشقند کے مرزا غالب محلّہ میں جب مشہور تاریخ دان قربانوف کی صاحبزادی کی رخصتی پر دعا مانگی جا رہی تھی تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ خالص قدیم ازبک روایات سے سجی شادی کی اس تقریب سے ایسا لگتا ہے کہ ازبکستان پر نہ تو کبھی زار روس کا تسلط رہا تھا اور نہ اس پر پچھلے ستر برس تک کمونسٹ نظام کا راج رہا ہے۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایک خواب دیکھ رہا ہوں اور پلک جھپکتے صدیوں پرانے دور میں چلا گیا ہوں جب کہ اس سرزمین پر شیریں فرہاد کی داستان تازہ تھی یا پھر یہ وہ زمانہ ہے جب تیمور کی سلطنت شمالی ہند سے لے کر روس کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی۔

باربار یہ سوال میرے ذہن میں ابھر رہا تھا کہ آخر کیسے اس ازبک قوم نے پچھلی ایک صدی کے دوران ان دو استبدادی ادوار میں اپنی مذہبی قدروں' تہذیب اور زبان کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے تروتازہ رکھا۔

اس وقت اچانک مجھے تاشقند کے اردو داں دانشور خال مرزایف تاش مرزا یاد آ گئے — ان سے جب ازبکستان کی پرانی روایات اور تہذیبی اقدار کی بات ہو رہی تھی تو انہوں نے بڑے فخر سے ازبک تہذیب کے بارے میں کہا تھا "یہاں مقامی روایات کی جڑیں بہت مضبوط ہیں۔ یہ روایات صدیوں پرانی نہیں بلکہ ہزاروں سال پرانی ہیں۔ اگر آپ ہندوستان' پاکستان کے برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ اور روایات کی

بات کریں تو یہ پندرھویں صدی سے شروع ہوتی ہیں۔ یعنی چھ سات سو سال پرانی تاریخ ہے ان روایات کی۔ لیکن یہاں کی روایات کی تاریخ تو ہزاروں سال پرانی ہے۔ تو ہزاروں سال پرانی تہذیب کو آپ سو سال میں کیسے تباہ کر سکتے ہیں۔ نہیں کر سکتے اور میں سمجھتا ہوں اور میں جانتا ہوں ہمارے ہاں' ہماری روایات ہماری مسلم روایات زیادہ مضبوط اور مستحکم ہیں بہ نسبت ہندوستان اور پاکستان کے۔۔۔ یہ واقعی عجیب بات ہے کہ قبل از اسلام ہماری جو تہذیب تھی وہ ہماری روایات میں بہت کارفرما ہے۔ بعض ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں آصف صاحب ہم انہیں زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ مثلاً میں جب بمبئی گیا تو وہاں ازبک لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے ہاں بہت سخت نظریاتی دور تھا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ تو وہاں غلام ہو گئے ہیں' تابعدار۔ وغیرہ وغیرہ اور یہ کہا کہ آپ نے سب کو کھو دیا۔ ان ازبک بھائیوں کی بات پر مجھے کچھ غصہ آیا۔ میں نے کہا کہ بھئی آپ تو نہ صحیح ازبک زبان بول سکتے ہیں۔ نہ دسترخوان بچھاتے ہیں' نہ بسم اللہ کرتے ہیں نہ پیالے میں چائے دیتے ہیں اور نہ بعد میں فاتحہ کرتے ہیں۔ یہ ساری باتیں ہم وہاں کرتے ہیں۔ آپ تو ان میں سے کوئی بات بھی نہیں کرتے۔۔۔

ڈاکٹر تاش مرزا کہہ رہے تھے کہ واقعی میں سمجھتا ہوں کہ ہماری تہذیبی جڑیں بہت مضبوط ہیں اور اسلامی روایات ہمارے لیے تہذیب کا ایک حصہ بن گئی ہیں۔ اگر ہم فاتحہ کرتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کٹر ہے مذہب کے سلسلے میں۔ لیکن یہ ہماری روایت ہے یہ ہماری تہذیب بن گئی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم میں سے ہر ایک مسجد جائے۔ نماز پڑھے اور روزے رکھے۔ لیکن ہمارے دل میں اسلام' ثقافت کا ایک حصہ ہے۔ ہاں آصف صاحب مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ میں جب پاکستان میں کراچی میں تھا ایوان دوستی میں تو وہاں میں نے ایک مرتبہ سوچا کہ بابر پر ایک تقریب منعقد کرائی جائے۔۔ چنانچہ ہم نے اپنے ماہانہ پروگرام میں یہ اعلان کر دیا کہ بابر پر ایک سیمینار ہو گا۔ اس سیمینار میں ایک دو پاکستانیوں نے تقریریں کیں' میں نے بھی تقریر کی جس کا اخبارات میں خاصا ذکر ہوا۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ

تقریب ہوتی ہمارے قونصل جنرل نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ تم یہ کیا کر رہے ہو۔ کسی بابر پر سیمنار کرا رہے ہو۔ سنا ہے کہ وہ بادشاہ تھا۔ یہ سوشلسٹ ایوان دوستی ہے۔ اس میں تم بابر بادشاہ کا ذکر کرنا چاہتے ہو۔ میں نے قونصل جنرل سے پوچھا کہ یہ کہاں سے خبر ملی ہے۔ تو پتہ چلا کہ کسی پاکستانی نے۔ کسی لال پاکستانی نے یہ پروگرام پڑھا ہو گا اور فوراً ٹیلی فون کر دیا ہمارے قونصل جنرل کو کہ یہ شخص بادشاہوں کی بات کرتا ہے ایک سوشلسٹ ایوان دوستی میں۔"

واقعی ازبک قوم کو اپنی تہذیب' اپنی ثقافت اور اپنی زبان پر جو بے پناہ فخر ہے اس کا مظہر۔ اپنے قومی شاعر' میر علی شیر نوائی کے ساتھ عقیدت میں نمایاں ہے۔ پچھلے سال (۹۱ء) ان کی پانچ سو پچاسویں سالگرہ بڑے تزک واحتشام سے منائی گئی تھی۔ اس موقع پر تاشقند کے وسط میں ان کے نام پر ایک وسیع پارک آراستہ کیا گیا ہے جس میں علی شیر نوائی کا قدآور مجسمہ تعمیر کیا گیا ہے۔ شہر کی ایک شاہراہ ان سے موسوم کی گئی ہے اور شہر کے ہر بڑے چوک میں وسیع بورڈ نصب کیے گئے ہیں جن پر ان کی تصویر کے ساتھ ان کے شعر تحریر ہیں۔ سمرقند میں ایک یونیورسٹی ان سے موسوم کی گئی ہے اور ملک کے ایک شہر کا نام "نوائی" رکھا گیا ہے۔

میر علی شیر نوائی ۱۴۴۱ء میں موجودہ افغانستان کے شہر ہرات میں پیدا ہوئے تھے جب کہ ہرات' خراسان کی سلطنت میں شامل تھا۔ ان کا خاندان تیمور کے دربار کے امراء میں سے تھا اور علی شیر نوائی خود بھی تیموری خاندان کے حکمران سلطان ابو غازی حسین بایقرا' کے دربار میں وزیر اعظم تھے۔ وہ جامی کے ساتھیوں میں سے تھے اور گو فارسی اور عربی میں ماہر تھے لیکن انہوں نے ترجیح اپنی ازبک زبان کو دی اور اس میں شاعری کر کے اسے مقبول بنانے کی کوشش کی۔

تاشقند یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز میں برصغیر کی زبانوں کے شعبہ کے صدر آزاد شاماتوف' علی شیر نوائی کو ازبک زبان کا بانی قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ازبکستان کے قدیم زمانہ میں جو ادبی ماحول تھا وہ پرانے ہند کے ادبی ماحول سے بہت قریب تھا بہت مماثلت رکھتا تھا۔ اس لحاظ سے کہ پہلے پہل یہاں ادبی

سرگرمیوں کو بڑھانے میں فارسی ادب کا بہت بڑا ہاتھ رہا' خاص طور پر وسط ایشیا میں جہاں فارسی بولنے والے بہت زیادہ لوگ تھے جیسے کہ تاجکستان۔ یہاں کے لوگوں کی زبان فردوسی' رودکی اور عبدالرحمان جامی جیسے شعراء سے وابستہ ہے۔ انھیں اپنے ادب کو پھیلانے میں آسانی تھی لیکن علی شیر نوائی اور دوسرے لوگوں کی زبان ترکی تھی۔ پہلے پہل وہ بول چال کی زبان کی شکل میں مروج تھی۔ پھر فارسی زبان کی مدد سے اور اس کے اثر سے ترکی زبان بھی رفتہ رفتہ ادبی شکل دھارنے لگی۔ علی شیرنوائی کی شہرت بھی یہاں بالکل ویسی ہے جو ھندوستان میں ولی دکنی ---- اردو کے سلسلہ میں حاصل ہے۔ میرے خیال میں علی شیر نوائی کا ہم امیرخسرو دہلوی سے بھی موازنہ کر سکتے ہیں کیونکہ علی شیر نوائی نے بھی زبان کی اصلاح اور حتیٰ کہ ہماری ثقافتی زندگی کو بدلنے میں بڑا رول ادا کیا ہے۔

علی شیر نوائی کی شاعری کا حسن چار دیوانوں اور چھ طویل مثنویوں پر پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے شاعروں اور ادیبوں کے حالات بھی اپنی کتاب "مجلس نفس" میں تحریر کیے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس سے پہلے جب بھی علی شیر نوائی کی سالگرہ کا جشن منانے کی کوشش کی گئی کوئی نہ کوئی رکاوٹ آفت کی صورت میں آ کھڑی ہوئی۔ ۱۹۴۱ء میں جب ان کی پانچ سویں سالگرہ منانے کا پروگرام تھا تو ھٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔ ۲۵ برس بعد جب ۵ سو پچیسویں سالگرہ کے جشن کا اہتمام کیا جا رہا تھا تو تاشقند میں تباہ کن زلزلہ آگیا۔

آخر کار پچھلے سال (۱۹۹۱ء) جب علی شیر نوائی کی ۵۵۰ ویں سالگرہ کا جشن منایا گیا تو سوویت یونین ہی کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔

یقیناً ازبک ہونے کے ناتے ڈاکٹر تاش مرزا نے پاک سوویت ایوان دوستی میں ازبک نژاد شہنشاہ ظہیرالدین بابر پر سیمینار کے ذریعہ اپنی تاریخ اور اپنی تہذیب کی شمع کی لو اونچی رکھنے کی کوشش کی لیکن بلاشبہ پچھلے ۷۰ برس کے دوران' کمیونسٹ دور میں ازبکستان کی تہذیب اور اس کے عوام کے مذہب اور ان کی زبان پر بھرپور وار کیے گئے۔

۱۹۱۳ء میں زار روس کے زیر تسلط وسط ایشیا میں مجموعی طور پر ۲۶ ہزار مساجد تھیں لیکن کمونسٹ انقلاب کے بعد ۱۹۲۸ء میں مساجد کے خلاف ایک منظم مہم شروع ہوئی اور دس سال کے اندر اندر اس علاقہ میں ۱۴ ہزار سے زیادہ مساجد بند کر دی گئیں۔ قرآن پاک کے نسخے نذر آتش کر دیے گئے اور دینی مدرسوں کو سینما گھروں میں منتقل کر دیا گیا۔

اس سے قبل کمونسٹ قیادت نے ازبک زبان کا عربی رسم الخط تبدیل کر دیا۔ پہلے حکم دیا گیا کہ ازبک زبان' لاطینی رسم الخط میں لکھی جائے۔ اس کے بعد روسی رسم الخط اختیار کرنے کا حکم دیا گیا اور آخر کار روسی زبان' جمہوریہ کی سرکاری زبان بنا دی گئی۔ تین سال پہلے "ازبک" کو مملکت کی زبان قرار دیا گیا ہے لیکن سرکاری کام کاج اب بھی روسی زبان میں ہوتا ہے۔

تاشقند میں امام بخاری انسٹی ٹیوٹ اعلیٰ دینی تعلیم کا جدید ادارہ ہے۔ جو ۱۹۷۱ء میں وسط ایشیا کے مسلم بورڈ اور چند مساجد کی مالی اعانت سے قائم ہوا تھا۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں ازبک اور قزاق زبان میں اٹھارہ سے پینتیس برس کے طالب علموں کو دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہاں خواتین کی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ اس ادارہ کے سربراہ نوجوان الحاج محمد لطیف ہیں۔

امام بخاری انسٹی ٹیوٹ' تاشقند کے اس علاقہ میں ہے جہاں اب بھی پتلی پتلی گلیاں ہیں اور ادھ کچے مکانات ہیں اور ان میں سے بہت سوں کی حالت خاصی خستہ ہو چکی ہے۔ اس علاقہ کی پہاڑی پر انسٹی ٹیوٹ کی جدید عمارت ہے لیکن اس کا ڈیزائن روایتی اسلامی ہے۔

بڑے سے پھاٹک سے داخل ہوتے ہی سامنے سیب اور بادام کا باغ نظر آتا ہے جس کے بیچ میں ایک وسیع چبوترہ ہے' گرمیوں میں نماز پڑھنے کے لیے۔ باغ کے دوسری طرف طالب علموں کی اقامت گاہ ہے اور اس طرف وسیع ہال ہے جس میں سردیوں میں نماز ادا کی جاتی ہے اور طلبا تلاوت کلام پاک کرتے ہیں۔ اسی کے بغل میں انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ الحاج عبداللطیف کا دفتر ہے۔ ان کے دفتر کی دوسری جانب

مدرسے کے بڑے بڑے کمرے ہیں۔

الحاج عبداللطیف بتا رہے تھے کہ ازبکستان اور وسط ایشیا کی دوسری جمہوریاؤں میں نوجوانوں میں اسلامی تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ اس تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ اس سال (۱۹۹۱ء) میں چھ سو طلبا نے داخلہ کی درخواست دی تھی جب کہ ہمارے ہاں صرف دو سو طلبا کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اعلیٰ اسلامی تعلیم کے لیے مزید دو سو طلبہ کی سہولت ہے اور ان کے علاوہ خواتین کے لیے چار سو نشستیں ہیں

الحاج عبداللطیف نے کہا کہ یہ بات خوشی کی ہے کہ ازبکستان کے دوسرے شہروں اور قصبوں میں بڑی تیزی سے مساجد میں اسلامی تعلیم کا انتظام کیا جا رہا ہے یوں نوجوانوں کے جذبہ اور شوق کی تشنگی پوری ہو سکے گی۔

دینی تعلیم کے سلسلہ میں الحاج عبداللطیف کو ایک بڑے مسئلہ کا شدت سے احساس تھا۔ انہوں نے اس بات پر سخت تاسف کا اظہار کیا کہ ازبک زبان کے قدیم رسم الخط کی تبدیلی سے یہاں اسلامی تعلیم کی بیخ کنی کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ رسم الخط بدلنے سے دینی تعلیم کا نظام یکایک درہم برہم ہو گیا اور طلبا کو دینی نصاب کے سلسلہ میں سخت مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور اساتذہ کا بھی مسئلہ سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ اب ہمیں اس مسئلہ کا حل تلاش کرنا ہوگا اور صورت حال کو بدلنا ہوگا۔

ازبکستان کی آزادی کے بعد اب یہ مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے کہ ازبک زبان کا روسی رسم الخط بدل کر دوبارہ عربی رسم الخط انذیار کیا جائے۔ لیکن آزاد شماتوف کا کہنا ہے کہ روسی رسم الخط ازبک زبان کے لیے مناسب ہے۔ انہوں نے کہا کہ زبان دان کے طور پر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس وقت ازبک زبان کا جو روسی رسم الخط ہے وہ ہماری ترکی نژاد زبانوں کی صوتیات اور ان کی تمام تر خصوصیات کی عکاسی کرتا ہے۔ ترکی زبان میں اور اس سے نکلی ہوئی وسط ایشیا کی۔ ازبک سمیت دوسری تمام زبانوں میں ایسے صوتیات ہیں جو نہ عربی میں ہیں اور نہ فارسی میں ہیں۔ یہ صوتیات بالکل منفرد ہیں۔ آزاد شماتوف کہہ رہے تھے کہ اشتراکی انقلاب کے بعد دو اصلاحات ہوئی

تھیں رسم الخط کے سلسلہ میں، پہلے پہل یہ کوشش کی گئی کہ ازبک زبان کے عربی رسم الخط کو بدل کر لاطینی رسم الخط اپنایا جائے۔ لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔ کیونکہ لاطینی رسم الخط، عربی رسم الخط کے مقابلہ میں اور زیادہ کمزور ثابت ہوا ہماری زبان کی صوتیات کو پیش کرنے میں۔ اس کے بعد۔ ازبک زبان کے لیے روسی رسم الخط اختیار کیا گیا۔

میں نے پوچھا کہ کیا رسم الخط بدلنے سے یہ نتیجہ نہیں نکلا کہ لوگ اپنے مذہب سے، قرآن پاک، اور عربی لٹریچر سے دور ہو گئے۔ آزاد شماتوف نے جواب دیا کہ میں سمجھتا ہوں کہ ایمان، مخصوص بات ہے۔ اگر ایمان میں آدمی ثابت قدم ہے اور وہ قرآن پاک سے اپنا رشتہ رکھنا چاہے گا تو وہ کسی بھی رسم الخط کو سیکھ کر اسے اپنا سکتا ہے چاہے وہ عربی ہو چاہے فارسی چاہے لاطینی۔

بہر حال رسم الخط کا یہ مسئلہ آزاد ازبکستان کے لیے ایک آزمائش ہے کہ کس طرح اس کے عوام اپنی مذہبی قدروں کے فروغ کی ضرورت اور سیاسی مصلحتوں کے مفادات میں توازن پیدا کرتے ہیں؟

دو طوفان

ازبکستان کی حزب مخالف ارک پارٹی کے سربراہ' محمد صالح سے ملاقات کا وقت صبح گیارہ بجے تھا لیکن میں کارل مارکس اسٹریٹ پر جہاں ان کا دفتر ہے بہت سویرے نکل آیا۔

تاشقند کے مشرق میں برف پوش تن شان کے سلسلے کے پہاڑ شہر کے محافظوں کی طرح کھڑے نظر آتے ہیں۔ طویل سردیوں کے بعد ایسا لگتا تھا کہ یہ سورج کی تمازت کو اپنے بازوؤں میں سمیٹنے کے لیے بے تاب ہیں لیکن سورج کی کرنیں' شہر میں داخل ہونے کے لیے مچل رہی تھیں بالکل اسی طرح جس طرح تندرست و توانا بچے کن ٹوپ اوڑھے دستانے اور گرم کوٹ پہنے' اپنی پیٹھ پر بیگ لٹکائے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں برف پر گرتے سنبھلتے' بھاگتے ہوئے اپنے اسکول جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی مائیں' کچھ شوخ رنگوں کے روایتی ازبک لباس میں اور کچھ مغربی لباس میں ملبوس اپنے اپنے کام پر جا رہی تھیں۔ یہ بات مجھے تاشقند میں بڑی نمایاں نظر آئی کہ یہاں خواتین بہت بڑی تعداد میں کام کرتی ہیں۔ آپ ہوٹل چلے جائیں' یا ریستوران' سپراسٹورس میں چلے جائیں یا بازار کی چھوٹی دکانوں میں' سرکاری دفتروں میں چلے جائیں یا کارخانوں میں' ہر جگہ آپ کو بڑی تعداد میں خواتین کام کرتی ہوئی نظر آئیں گی۔۔۔ ایک اندازہ کے مطابق ساٹھ فی صد سے زیادہ خواتین برسرروزگار ہیں۔ تعلیم ان میں سو فیصد ہے۔۔۔ جسے یہ سوشلزم کی دین سمجھتی ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ چند برس

پہلے ازبکستان کی کل دو کروڑ افراد کی آبادی میں سائنس دانوں' ڈاکٹروں' انجینئروں اور دانشوروں کی تعداد چالیس ہزار تھی جن میں سولہ ہزار خواتین تھیں۔

کمونسٹ انقلاب سے پہلے زار روس کے زمانے میں ازبکستان میں ایک لاکھ افراد کے لیے صرف ایک ڈاکٹر تھا۔ زار روس کے دور میں ازبکستان تین خانوں کی ریاستوں' خیوا' بخارا اور خوارزم پر مشتمل تھا اور یہ ریاستیں' زار روس کی حاشیہ بردار تھیں۔ اس زمانے میں خود ان خانوں کے خلاف عوام میں لاوا پک رہا تھا جس کا مظہر اس علاقہ میں دو اہم تنظیموں کا قیام تھا۔ ایک "مسلم کاونسل" اور دوسری "علماء جمعیتی" جس کے سربراہ شیر علی لپکن تھے۔ اس وقت دو موقف تھے۔ ایک یہ کہ "ملی مدنی مختاریات" یعنی ثقافتی خودمختاری کا مطالبہ کیا جائے۔ دوسرا موقف تھا کہ علاقائی خودمختاری کے لیے جدوجہد کی جائے۔ اس دوران سلطان غالی ایف اور ملا نور واحدوف کی قیادت میں مسلم کمونسٹ پارٹی قائم ہوئی۔ ان کی رائے تھی کہ وسط ایشیا میں مغربی انداز کے کمونزم کے بجائے' اسلام کی ثقافتی اور روحانی روایات کو برقرار رکھا جائے اور اسلامی انقلاب کے پہلو کو اجاگر کیا جائے۔

کمونسٹ انقلاب کے بعد جب وسط ایشیا میں کمونزم کا اثر پھیلنا شروع ہوا تو برطانیہ کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں کمونزم کا سیلاب اور اس کے ساتھ روس کا اثر وسط ایشیا کے راستے برصغیر میں نہ امڈ آئے۔ اسی خطرہ کے پیش نظر' برطانیہ نے اس علاقے میں اپنی فوجی مہم بھیجی۔۔۔ بس پھر کیا تھا' ماسکو کو ریڈ آرمی وسط ایشیا بھیجنے کا بہانہ مل گیا اور ۱۹۲۴ء تک ریڈ آرمی نے پورے وسط ایشیا پر قبضہ کر لیا۔

بہت سے ازبکوں کی رائے ہے کہ اگر برطانیہ وسط ایشیا میں اتنی عجلت میں فوجی مداخلت نہ کرتا تو ممکن ہے کہ ریڈ آرمی کو کارروائی کا جواز نہ ملتا اور اس علاقے میں کمونزم کے خلاف مزاحمتی تحریک کو مضبوط اور موثر ہونے کا موقع مل جاتا۔

لیکن بعض ازبک دانشور یہ سمجھتے ہیں کہ اس مزاحمتی تحریک کی عوام میں جڑیں مضبوط نہیں تھیں اور عوام' خود خانوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔

تاشقند میں پاکستان کے تجارتی ادارے تابانی کارپوریشن کے کرتا دھرتا' عباس

خان' بارہ سال پہلے انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے ماسکو گئے تھے۔ اور پچھلے گیارہ برس سے تاشقند میں مقیم ہیں۔ مجھے اس ضمن میں ان کی یہ بات یاد آئی جب وہ وسط ایشیا میں دو طوفانوں کا ذکر کر رہے تھے ایک جو زار روس کے تسلط کے ساتھ اور دوسرا ستر برس پہلے کمونسٹ انقلاب کے بعد اس علاقہ میں آیا۔

عباس خان کہہ رہے تھے کہ بنیادی طور پر دونوں طوفانوں کے بیچ خاصا فرق ہے۔ پہلا طوفان جو زار روس کے دور میں آیا اس کا مقصد اس علاقہ پر قبضہ کر کے اس کو اپنی نو آبادی بنانا تھا اور اس علاقے کے لوگوں پر اپنی مرضی اور حکمرانی تھوپنا تھا۔ دوسرا طوفان جو ستر سال پہلے آیا اس کا مقصد ان افراد کو کچلنا تھا جو یہاں حکمران تھے اور ان عوام کی مدد کرنا تھا جو ان حکمرانوں کے استحصال کا شکار تھے۔۔۔ اس علاقے کے عوام نے جو غریب اور کسان تھے اور بڑے بڑے خانوں اور جاگیرداروں کے غلام تھے' اس وقت یہ سوچا کہ اگر ہم لینن کا ساتھ دیں اور سوشلزم کی حمایت کریں تو ہمیں ان ظالم مفاد پرست عناصر سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ چنانچہ ان غریب عوام اور کسانوں نے لینن کا ساتھ دیا۔ مثال کے طور پر تاشقند میں ریلوے کا جو کارخانہ تھا اس کے مزدوروں نے سب سے پہلے سوشلزم کے حق میں آواز بلند کی۔۔۔ ان کے مقابلہ میں جو کٹر مذہبی لوگ تھے اور جو چاہتے تھے کہ پرانا جاگیرداری نظام برقرار رہے اور جو خانوں اور جاگیرداروں کے حامی تھے انہوں نے سوشلزم کی مخالفت کی۔ یوں اس زمانے میں جو لڑائی ہوئی اس میں ایک طرف غریب اور کسان تھے اور دوسری طرف خان' اور جاگیردار اور ان کے ساتھ مذہبی علماء اور ملا تھے۔ غریب عوام کو نہ تو مذہب کے بارے میں کچھ زیادہ علم تھا اور نہ سیاست کے بارے میں جانکاری تھی۔۔۔ ان کو محض یہ احساس تھا کہ اگر ہماری جان ان خانوں اور جاگیرداروں سے چھوٹ سکتی ہے تو صرف لینن کے طفیل اور سوشلزم کے ذریعہ۔۔۔ اس صورت حال میں' یہاں کے غریب عوام اور کسانوں کو ماسکو نے "سپورٹ" کیا اور یہاں کے جو خان اور جاگیردار تھے ان کی مغرب نے حمایت کی۔۔۔ اس لڑائی میں ماسکو والے جیت گئے اور یوں یہاں سوشلسٹ ڈھانچا قائم ہوا جس میں سوشلسٹ پارٹی برسراقتدار آگئی لیکن اس کے

فوراً بعد خانوں اور جاگیرداروں نے سنبھالا لیا اور کچھ تو یہاں سے فرار ہو گئے اور جو بچ گئے انھوں نے کمونسٹوں کا بھیس بدل لیا اور پارٹی میں شامل ہو گئے۔۔۔ ان کی وجہ سے یہاں پارٹی جاگیردارانہ انداز سے چلی۔"

بہرحال کمونسٹ انقلاب کے بعد پورے وسط ایشیا کا نقشہ یکسر بدل گیا۔ ماسکو کی کمونسٹ قیادت نے ازبکستان، قزاقستان، کرغیزیہ، تاجکستان اور ترکمانیہ کے نام سے سوویت جمہوریائیں تشکیل کیں اور ان کی سرحدیں نسلی بنیاد پر کھینچیں۔ گو بہت سے لوگ اس بات پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں کہ کمونسٹوں نے اس پورے ترکستان کو مختلف جمہوریاؤں میں بانٹ کر الگ الگ قومیتوں کے احساس کو شہہ دی لیکن کمونسٹوں کا یہ استدلال ہے کہ نسلی بنیاد پر سوویت جمہوریائیں قائم کر کے دراصل اس علاقہ میں اس نسلی معرکہ آرائی کو ختم کیا گیا جو کمونسٹ انقلاب سے پہلے خوں ریز شکل اختیار کر گئی تھی۔ ۱۸ء میں خیوا پر ترکمانوں کے حملے اور ۲۰ء میں ایک رات میں ازبکوں کے ہاتھوں ایک ہزار سے زیادہ ترکمانوں کے قتل عام کی تلخ یادیں ابھی تک اس علاقے کے لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہیں۔

میں وسط ایشیا کی تاریخ کے تانوں بانوں میں اتنا الجھ گیا کہ وقت کا احساس نہ رہا اور بھول گیا کہ ازبکستان کی حزب مخالف ارک پارٹی کے سربراہ محمد صالح سے گیارہ بجے ملاقات کا وقت طے ہے۔

میں جب ارک پارٹی کے دفتر میں داخل ہوا تو ایسا لگا کہ یہ سیاسی پارٹی کا دفتر نہیں بلکہ کسی تجارتی یا صنعتی Consultant ادارے کا دفتر ہے، ہر چیز بڑی باقاعدہ تھی اور خاموشی نمایاں تھی۔

۴۲ سالہ محمد صالح ایک بڑے سے ہال میں دوسرے سرے پر ایک بڑی سی میز پر بیٹھے تھے۔ ہال میں ایک طرف کرسیوں کے ساتھ مہمانوں کے لیے لمبی سی میز، کسی تجارتی کمپنی کے بورڈ روم کی میز کی طرح بچھی ہوئی تھی۔

محمد صالح نے جو ایک ممتاز ادیب بھی ہیں، ارک پارٹی یعنی جماعت آزادی، ۱۹۹۰ء میں خفیہ طور پر منظم کی تھی۔ اگست ۹۱ء کے اوائل میں گورباچوف کی حکومت کا تختہ

الٹنے کی کوشش کے بعد ۳۱ اگست کو ازبکستان نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تھا' ستمبر ۹۱ء میں جب ازبکستان میں کمونسٹ پارٹی کے علاوہ دوسری سیاسی جماعتوں کے قیام کی اجازت دی گئی تو ارک پارٹی کو قانونی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس وقت تک ارک پارٹی کے اراکین کی تعداد چھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ارک پارٹی' ازبکستان کی پہلی جماعت تھی جس نے سوویت یونین سے آزادی کا نعرہ بلند کیا تھا۔

دسمبر ۹۱ء میں صدارتی انتخاب میں محمد صالح نے صدر اسلام کریموف کا مقابلہ کیا لیکن انہیں صرف ۱۲ فی صد ووٹ ملے اور وہ ہار گئے۔ وجہ اس کی محمد صالح نے یہ بیان کی کہ ہمارے مدمقابل سابق کمونسٹ حکمران تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ جمہوریت پسندوں کی جیت ہو۔ ان پرانے کمونسٹوں نے جو' اب اپنے آپ کو پیپلز ڈیمو کریٹس کہلاتے ہیں اس صدارتی انتخاب میں دھاندلی کی۔ پھر انتخابی مہم میں ہمیں پورے مواقع نہیں دیے گئے۔۔۔۔ گو پانچ اخبارات میں ہمارا پروگرام شائع ہوا لیکن ٹیلی ویژن پر ہمیں اپنا موقف پیش کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ چالیس دن کی انتخابی مہم کے دوران' ٹیلی ویژن پر مجھے صرف پندرہ منٹ دیے گئے جب کہ ہر روز صدر کریموف آدھے آدھے گھنٹے تقریر کرتے تھے۔"

ایک عام تاثر یہ ہے کہ ازبکستان کو آزادی' حالات نے سونے کی طشتری میں رکھ کر پیش کی ہے۔ سوویت یونین کا شیرازہ نہ بکھرتا تو وسط ایشیا کی کسی جمہوریہ کو آزادی نہ ملتی۔ اور یہ بات ایک لحاظ سے درست ہے کیونکہ پچھلے سال ۹۱ء میں سوویت یونین کے نئے اتحاد کے ڈھانچے کے لیے جو ریفرنڈم ہوا تھا اس میں ازبکستان نے بھاری اکثریت سے نئے ڈھانچے کے حق میں ووٹ دیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ عباس خان کا کہنا ہے کہ ازبکستان کے عوام نے آزادی کے لیے قربانی نہیں دی۔ "یہاں کے لوگوں نے بنیادی طور پر آزادی کے لیے جدوجہد نہیں کی۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ کچھ روشنی آئے لیکن کسی نے سوویت یونین کے خلاف جدوجہد نہیں کی اور نہ سوویت یونین سے الگ ہونے کے لیے کوئی تحریک چلائی۔ کوئی ایسی قیادت بھی نہیں ابھری جس نے یہ کہا ہو کہ ہم سوویت یونین کو خیرباد کہنا چاہتے

ہیں--- پچھلے چند برسوں میں جو عناصر ابھرے وہ بھی سوویت یونین میں پریس ٹرائیکا۔ آزاد خیالی کے دور میں ابھرے جب گورباچوف نے کہا کہ آپ کو آزاد ہونا چاہیے اور آپ کو جمہوریت ملنی چاہیے--- یہ بات ہے ۱۹۸۵ء کی۔ اس وقت نہ صرف وسط ایشیا میں بلکہ سابق سوویت یونین کی دوسری جمہوریاؤں میں بھی جو افراد برسراقتدار ہیں وہ سب وہی ہیں جو اس سے پہلے کمونسٹ تھے۔"

میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ تو اس صورت حال میں لوگ کیا سوچتے ہیں کہ واقعی ملک حقیقی معنوں میں آزاد ہو گیا ہے؟ یہ سوال جب میں نے ارک پارٹی کے سربراہ محمد صالح سے کیا تو انھوں نے کہا کہ "آزادی حاصل تو ہوئی ہے لیکن اقتصادی اور سیاسی طور پر ابھی پوری طرح آزادی نہیں ملی۔ اقتصادی طور پر ازبکستان کا بڑی حد تک دارومدار روس پر ہے۔ ویسے یہ صحیح ہے کہ خود روس کے اقتصادی مفادات بھی ازبکستان سے وابستہ ہیں۔ بہرحال مکمل آزادی نہ سہی لیکن یہ عبوری دور ہے اور اس دوران اس بات کا خطرہ ہے کہ ملک آمریت کی طرف چل نکلے۔ لیکن موجودہ سابقہ کمونسٹ قیادت زیادہ دیر تک اقتدار میں نہ رہ سکے گی۔"

ازبکستان میں ازبک قوم کی تعداد صرف ۶۵ فی صد ہے۔ ۳۵ فی صد سے زیادہ روسی' آرمینائی' یہودی اور دوسری نسلیں آباد ہیں۔ ان میں سمرقند اور بخارا کے یہودی منظم اور بااثر ہیں۔

تاشقند میں بتایا جاتا ہے کہ ۵۰ ہزار کے لگ بھگ آرمینائی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نسلی اقلیتوں کی بڑی تعداد کا صدر اسلام کریموف کی خارجہ پالیسی پر گہرا اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے آزادی کے پانچ مہینے بعد ہی اسرائیل کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا ہے۔

ارک پارٹی کے محمد صالح اس فیصلہ کے خلاف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "موجودہ حکمرانوں نے اسرائیل کو تسلیم کرنے میں بہت عجلت سے کام لیا ہے اور اس میں مصلحت کو بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ ہم اس وقت جب کہ فلسطینیوں پر ظلم ہو رہا ہے اور انھیں حق خود ارادیت حاصل نہیں اسرائیل کو تسلیم کرنے کا فیصلہ نہیں

کرتے۔"

گو اسرائیل کو تسلیم کرنے کے متنازعہ معاملہ میں تو صدر کریموف نے اتنی سرعت سے فیصلہ کیا ہے لیکن ملک کے مستقبل سے متعلق مسائل کے بارے میں فیصلوں میں وہ بہت تساہل سے کام لے رہے ہیں۔ ویسے انہوں نے یہ تو کہا ہے کہ ملک کا نیا سیاسی نظام' ترکی کے طرز پر ہو گا لیکن ابھی تک اس کا خاکہ انہوں نے تیار نہیں کیا۔ نتیجہ یہ کہ اب حزب مخالف ارک پارٹی نے اعلان کیا ہے کہ وہ خود نئے آئین کا اپنا مسودہ تیار کرے گی۔

صدر کریموف نے مذہبی بنیاد پر سیاسی جماعتوں کی تشکیل کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن ان کے اس فیصلہ پر ناراضگی بڑھ رہی ہے۔ لہذا اس بات کا خطرہ ہے کہ آئین اور سیاسی جمہوری حقوق کے مسئلہ پر صدر کریموف اور حزب مخالف کے درمیان معرکہ آرائی کہیں پڑوسی جمہوریہ تاجکستان کی صورت نہ اختیار کر جائے۔

برصغیر سے تاریخی روابط کی تجدید

سوویت یونین کا شیرازہ منتشر ہونے کے بعد وسط ایشیا کی نو آزاد جمہوریاؤں نے سرمایہ دارانہ نظام کی مارکیٹ اکنامی یعنی بازار کی آزاد معیشت کے نظریہ کو اس بے تابی سے اختیار کرنے کی کوشش کی ہے کہ جیسے یہی ان کے لیے واحد راہ ہے ان ساری مشکلات اور تمام مسائل سے نجات کی جو کمونزم کا ستر سالہ دور ان کو ورثہ میں چھوڑ گیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان سابق جمہوریاؤں کی قیادت اور عوام کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ کمونزم کی ناکامی کے بعد اب صرف سرمایہ دارانہ نظام ہی ان کی کامیابی کی کلید ہے۔ اور اس کے علاوہ نہ کوئی چارہ کار ہے اور نہ کوئی متبادل راہ۔

ازبکستان نے بھی آمنا و صدقنا اپنی معیشت کا یہی ڈھانچا اپنایا ہے اور اس کے حصول کے لیے اپنا الگ انداز اختیار کیا ہے۔

ازبکستان کی سرزمین اپنی قدیم تہذیب اور درخشاں تاریخ کی بدولت' سیاحی کے پرکشش مقامات سے مالا مال ہے' سامانی اور تیموری دور کے پرشکوہ سمرقند اور بخارا' خیوا اور شہر سبز اور فرغانہ وادی جس نے برصغیر کو مغل فرما روا دیے' صدیوں سے سیاحوں کی واماندگی شوق کے لیے پناہیں فراہم کرتی رہی ہے۔

اسی بنا پر ازبکستان نے نج کاری کی مہم میں پہل سیاحت کے شعبہ سے کی ہے اور اس مقصد کے لیے "سیورغ انٹر" کا ادارہ قائم کیا ہے۔۔۔۔ اس کے سربراہ قربان

تلیا گانوف ہیں جو پہلے تاشقند میں سابق سوویت یونین کے ادارے "ان تورسٹ" کے سربراہ رہ چکے ہیں۔ ان تورسٹ کا ادارہ سابق سوویت یونین میں غیر ملکی سیاحوں اور مسافروں کے سفر اور قیام کے تمام انتظامات کا ذمہ دار تھا۔ اب اس ادارہ کا انتظام روس کے ہاتھ میں ہے۔۔۔ قربان تلیا گانوف' ایک عرصہ پاکستان میں بھی رہ چکے ہیں اور اسی مناسبت سے یہ اردو سے واقف ہیں۔

گو سیوخ انتر' نجی ادارہ ہے جس کے قیام میں حکومت نے مالی امداد دی ہے لیکن اس کا دفتر سرکاری دفاتر کی عمارت میں ہے۔ قربان تلیا گانوف میری الجھن بھانپ گئے اور انہوں نے اس ادارے کی تشکیل کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا یہ ادارہ حکومت نے قائم کیا ہے اور اس کے قیام کے لیے حکومت نے رقم فراہم کی ہے اور ہم سے کہا ہے کہ ہم اس ادارے کو چلائیں اور جب ہمیں آمدنی ہونے لگے تو ہم حکومت کی رقم واپس کر دیں۔ ہمارا کام' سیاحت میں نجی اداروں کو لائسنس جاری کرنا ہے اور ان کی مدد کرنا ہے۔ ابھی سے بہت سے نجی اداروں نے سیاحت کے شعبہ میں کام کرنا شروع کر دیا ہے۔

میں نے پوچھا کہ اتنے طویل عرصہ تک یہاں سوشلسٹ نظام رہا ہے کیا لوگوں کے پاس اتنے وسائل اور تجربہ ہے کہ وہ اپنے طور پر نجی ادارے قائم کر سکیں؟ قربان تلیا گانوف نے اعتراف کیا کہ واقعی اس سلسلہ میں بہت زیادہ مشکلات ہیں اور سب سے پہلے لوگوں کے ذہنوں کو تبدیل کرنا ہو گا۔ لیکن امید ہے کہ موجودہ مشکلات پر جلد قابو پا لیا جائے گا۔۔ ویسے یہ کام وقت طلب ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ستر سال کے کمونسٹ نظام کی جگہ راتوں رات معیشت کا سرے سے نیا نظام قائم نہیں کیا جا سکتا اور اس میں واقعی طویل عرصہ لگے گا۔ لیکن سابق سوویت یونین میں ازبکستان اور وسط ایشیا کی دوسری مسلم جمہوریاؤں کی معیشت چونکہ بنیادی طور پر خام مال پیدا کرنے والی معیشت تھی جس کا دارومدار' سارا کا سارا' سابقہ سوویت یونین پر تھا لہٰذا ان کے لیے معیشت کی نئی راہ بڑی کٹھن اور مسائل و مشکلات سے اٹی ہوئی ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ ناتجربہ کاری کا ہے۔ تاشقند میں پاکستان

کے تجارتی ادارے نمایاں کارپوریشن کے کرتا دھرتا عباس خان نے اس صورت حال کی پیچیدگی کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ یہ عمل ایسا ہے جو آہستہ آہستہ ہو رہا ہے کیونکہ یہاں لوگوں کو نجی کاروبار کا تجربہ نہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ اس سے پہلے' یہاں کی معیشت پر ماسکو کا پورا کنٹرول تھا۔ ماسکو کے حکام غیر ملکی تجارت سے متعلق تھے اور انہیں ہی اس کا تجربہ تھا۔ اب اچانک یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور ماسکو کے حکام نے ان جمہوریاؤں کے حکام سے کہا کہ اب آپ سے ہمارا تعلق ختم ہو گیا اور اب آپ خود غیر ملکی تجارت کا کام سنبھالیں۔ مشکل یہ ہے کہ یہاں کے حکام کو نہ تو غیر ملکی تجارت کے بارے میں کچھ علم ہے اور نہ لوگوں کو اس بارے میں جان کاری ہے کہ غیر ملکی تاجروں سے کس طرح رابطہ قائم کیا جائے۔ درآمد و برآمد کے لیے کیا کرنا چاہیے ــــ اس وقت ضرورت ہے کہ پاکستان اور وسط ایشیا کے پڑوسی ملک' غیر ملکی تجارت کے سلسلہ میں یہاں کے حکام اور لوگوں کی مدد کریں۔"

ازبکستان میں نجی کاروبار اور غیر ملکی لین دین میں تجربہ کے فقدان کی وجہ سے معیشت کے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی کی رفتار بے حد سست ہے۔ حزب مخالف ارک پارٹی کے سربراہ محمد صالح کا کہنا ہے کہ معیشت میں نئی اصلاح کی رفتار نہ صرف سست ہے بلکہ نج کاری کا میدان بھی بہت محدود ہے۔ ان کی شکایت ہے کہ ابھی تو صرف لوگوں کو اپنی دکانیں کھولنے کی اجازت ملی ہے لیکن انہیں ایسا کاروبار شروع کرنے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ نجی ملکیت صرف دکانوں اور چھوٹی فیکٹریوں تک محدود ہے۔ ہمارا موقف ہے کہ زمینوں کی بھی نجی ملکیت کا حق دیا جائے۔ بھلے اس وقت بھاری صنعتوں کو سرکاری ملکیت میں رکھا جائے لیکن دوسرے مرحلہ میں ان کو بھی نجی ملکیت میں دینا چاہیے۔ صدر اسلام کریموف نج کاری کے پروگرام میں زمین کی نجی ملکیت کے حق میں نہیں ہیں۔

ارکن واحدوف' ازبکستان کے ممتاز شاعر ہیں' جنہوں نے کمونسٹ دور میں بے دھڑک انداز سے انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کے لیے آواز اٹھائی ہے۔ ارکن واحدوف ازبکستان کی پارلیمنٹ کے رکن ہیں۔ وہ بھی معیشت کے ڈھانچے میں تبدیلی

اور نج کاری کی سست رفتاری کے شاکی ہیں اور انہیں اس بات پر بھی تشویش ہے کہ پرانا نظام اب بھی کسی نہ کسی شکل میں برقرار ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اب بھی ذرائع پیداوار اور کارخانے حکومت کے ہاتھ میں ہیں اور پیداوار کے اور حکومت کرنے کے طریقے اب بھی وہی پرانے چلے آ رہے ہیں۔ بیورو کریسی بھی اسی طرح سے کام کر رہی ہے۔۔ ارکن واصدوف کہہ رہے تھے کہ میں اکثر اوقات سوچتا ہوں کہ اگر پوری دنیا کے بیوروکریٹس کو اکٹھا کر دیا جائے تو ان کے مقابلے میں ہمارے بیوروکریٹس جیت جائیں گے۔ بہرحال یہ بات لوگوں کے سمجھ میں آ گئی ہے کہ مارکیٹ اکنامی کا کوئی متبادل نہیں' لیکن مارکیٹ اکنامی کا یہ مطلب نہیں کہ ساری طاقت اور پیداوار حکومت کے ہاتھ میں ہو' چیزیں بازار میں نہ ہوں اور قیمت کھلی چھوڑ دی جائے۔

میں نے پوچھا کہ اگر یہ صورت حال جاری رہی اور لوگوں میں بے چینی بڑھ گئی تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ اس کے جواب میں ارکن واصدوف نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ پیداوار اور زمین کو لوگوں کی ملکیت میں دے دیا جانا چاہیے' اگر ایسا نہ کیا گیا تو حالات بہت خراب ہو جائیں گے۔ اگر چھ ماہ کے اندر کوئی واضح اقدام نہ کیا گیا تو لوگ تباہ کن انداز سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

تاشقند کے صحافی' دادا خان نوری کہتے ہیں کہ اس وقت قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے شہروں میں تو اتنی مشکل نہیں جتنی کہ دیہات میں ہے۔ اس وجہ سے وہاں بے چینی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

ازبکستان میں یہ احساس بہت شدید ہے کہ کمونسٹ دور میں اس کے گراں قدر قدرتی وسائل کا ماسکو نے استحصال کیا ہے۔ سابق سوویت نظام میں ازبکستان کی معیشت کو کپاس کی پیداوار کا غلام بنا دیا گیا تھا۔ ۹۱ء میں جب سوویت یونین بکھری تو اس وقت پورے سوویت یونین کی ۷۳ فی صد کپاس' ازبکستان میں پیدا ہوتی تھی۔ پچاس لاکھ ٹن سے زیادہ' جو پورے سوویت یونین کے کپڑے کے کارخانوں کی ضرورت پوری کرتی تھی۔

نتیجہ یہ کہ دوسری اشیا کی پیداوار اور صنعتوں کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ پھر

کپاس کی اس وسیع پیمانے پر کاشت ماحولیاتی اعتبار سے ازبکستان کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ ایک تو اس علاقہ کے دریاؤں سے آب پاشی کے لیے اتنا زیادہ پانی لیا گیا ہے کہ پچھلے بیس برس میں ارال کا سمندر کم ہو کر آدھا رہ گیا ہے۔

پھر کپاس کی کاشت کے لیے اتنی کیمیاوی کھاد استعمال کی گئی ہے کہ زمین میں زہر سرایت کر گیا ہے اور اس کی وجہ سے پینے کے پانی سے طرح طرح کی بیماریاں پھیل رہی ہیں۔

گزشتہ ستر برس سے ازبکستان کی معیشت کا روس پر اتنا دارومدار رہا ہے کہ یہ ایک اعتبار سے روس کا معاشی نظر بند ہو کر رہ گیا ہے۔

عباس خان موجودہ صورت حال کے خطرات کی یوں وضاحت کرتے ہیں۔ "اگر یہ لوگ اقتصادی طور پر روس سے الگ ہو جائیں تو ان کی معیشت کل ٹھپ پڑ جائے گی۔ تاشقند کے تمام کارخانے' روسی پرزہ جات کے بغیر نہیں چل سکتے۔ یا تو مشینوں کے کل پرزوں کے لیے متبادل انتظام کرنا ہو گا یا پھر بالکل نئے کارخانے قائم کرنے ہوں گے۔ یہاں کی معیشت اور یہاں کی صنعت کا ڈھانچا اشتراکی انداز سے قائم ہوا ہے۔ مثلاً یہاں مٹی کے سنہری نقشیں برتن بنانے کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ اس کارخانے کے لیے خاص مٹی۔ یوکرین سے آتی ہے' اور ان برتنوں میں نقش و نگار کے لیے جو سونا استعمال ہوتا ہے وہ ہے تو یہاں کا لیکن صاف ہونے روس جاتا ہے۔ لہٰذا' مٹی کے برتن بنانے کا یہ کارخانہ اس وقت تک نہیں چل سکتا جب تک مٹی' یوکرین سے نہ آئے اور صاف کیا ہوا سونا روس سے نہ آئے۔۔۔ اسی طرح یہاں کی کپاس کا حال ہے۔ ازبکستان میں جتنی کپاس پیدا ہوتی ہے اس میں سے صرف ۸ فی صد کپاس یہاں کارخانوں میں استعمال ہوتی ہے باقی ساری کپاس' روس میں کپڑے کے کارخانوں میں استعمال ہوتی ہے۔۔۔ پھر ازبکستان میں ساری درآمد و برآمد۔ روس اور یوکرین کی بندرگاہوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔۔ اگر وہاں سامان رک جائے تو یہاں کارخانے بند ہو جائیں اور اشیاء کی زبردست قلت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ازبکستان اس بات کا متمنی ہے کہ افغانستان کے راستے' پاکستان کی بندرگاہ تک رسائی ہو اور اس

راستے سے سامان درآمد اور برآمد ہو۔ یوں روس اور یوکرین پر دارومدار کم ہو سکے گا۔"

گو ابھی افغانستان کے راستے کراچی کی بندگارہ تک پہنچنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دیر لگے گی لیکن مارچ ۹۲ء کی بارہ تاریخ کو جب دف اور سرنائی کی دھن پر ازبک دوشیزاؤں نے روایتی خیرمقدمی رقص کے ساتھ تاشقند کے ہوائی اڈے پر پی آئی اے کی افتتاحی پرواز کا خیر مقدم کیا تو باہر کی دنیا پر ازبکستان کا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔

باب ۸

وسط ایشیا کے نوجوان مفتی

وسط ایشیا کی تمام نو آزاد مسلم جمہوریاؤں کے مفتی اعظم کا دفتر تاشقند میں، بارک خان کے مدرسہ میں ہے جس کی عمارت دو سو سال پرانی ہے۔ اس کے بالکل سامنے جامع مسجد ہے جو اسی دور کی ہے۔ جامع مسجد کے میوزیم میں قرآن پاک کا وہ نادر نسخہ رکھا ہے جو مصحف عثمانؓ کہلاتا ہے۔

کلام پاک کا یہ نسخہ جو خط کوفی میں ہے ان چھ اولین نسخوں میں سے ایک ہے جو حضرت عثمانؓ کے دور میں تحریر کیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک نسخہ مکہ معظمہ بھجوایا گیا تھا اور ایک مدینہ منورہ میں رکھا گیا تھا۔ تین نسخے، دوسرے اسلامی مراکز کو بھجوائے گئے تھے اور ایک حضرت عثمانؓ نے خود اپنے پاس رکھا تھا۔ یہی نسخہ، مصحف عثمانؓ کہلاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قرآن پاک کا یہ قدیم ترین نسخہ، امیر تیمور، شام سے اپنے ساتھ سمرقند لائے تھے۔ ترکستان پر روس کے قبضے کے بعد مصحف عثمانؓ پیٹرس برگ لے جایا گیا تھا۔ کمیونسٹ انقلاب کے بعد لینن نے حکم دیا تھا کہ قرآن پاک کا یہ نسخہ دوبارہ مسلمانوں کی تحویل میں دے دیا جائے۔ چنانچہ مصحف عثمانؓ ایک خاص ٹرین میں زبردست پہرہ کے ساتھ پہلے "اوفا" لے جایا گیا اور اس کے بعد تاشقند جہاں اسے ازبکستان کے تاریخی میوزیم میں رکھا گیا تھا۔

تین سال ہوئے ازبکستان کی حکومت نے مصحف عثمانؓ وسط ایشیا کے مسلم مذہبی بورڈ کے حوالے کیا جو اب جامع مسجد کے میوزیم میں رکھا گیا ہے۔

جامع مسجد اور بارک خان کے مدرسے کے تیراہے پر سینما گھر کی ایک عمارت کھڑی ہے۔ جو ہے تو جدید طرز کی لیکن انتہائی بدہیئت' اب معلوم ہوتا ہے کہ جامع مسجد اور بارک خان کے مدرسے کی عمارتوں کے حسن کو مسخ کرنے کے لیے عمداً کنکریٹ کا ایک پہاڑ نما بھوت کھڑا کر دیا گیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ سینما گھر کی عمارت کمیونزم کے اس دور کی یادگار ہے جب وسط ایشیا میں مساجد اور مسلم مدرسوں کو بند کرنے اور انہیں مسمار کرنے کی مہم زوروں پر جاری تھی۔ یہ زمانہ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۱ء تک کا تھا جب بخارا میں ساڑھے چار سو سال پرانا مدرسہ' میر عرب اور بارک خان کا مدرسہ بھی بند کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۱۷ء کے کمیونسٹ انقلاب سے پہلے وسط ایشیا میں جو روسی ترکستان کہلاتا تھا' بیس ہزار سے زیادہ مساجد تھیں۔ ۱۹۵۳ء میں ان مساجد کی تعداد صرف تین سو رہ گئی۔ خود بارک خان کا مدرسہ ۵۸ء تک بند رہا۔

اب اس مدرسے میں پورے وسط ایشیا کے مفتی اعظم کا دفتر ہے جو وسط ایشیا اور قزاقستان کے مفتی کہلاتے ہیں کیونکہ سابق سوویت یونین میں قزاقستان کو وسط ایشیا کا حصہ تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ اس مدرسے میں وسط ایشیا اور قزاقستان کے مسلم مذہبی بورڈ کا بھی دفتر ہے جو مفتی صاحب کی قیادت میں وسط ایشیا کی تمام مساجد اور مدرسوں کا انتظام کرتا ہے اور ان میں دینی تعلیم کے علاوہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کے مذہبی مفادات اور مسائل کا بھی نگران ہے۔

وسط ایشیا کے مفتی اعظم کا عہدہ منتخب عہدہ ہے۔ وسط ایشیا کی پانچوں جمہوریاؤں کے قاضی امام اور مسلم بورڈ کے اراکین ان کا انتخاب کرتے ہیں۔

موجودہ مفتی اعظم' حاجی محمد صادق بن محمد یوسف ہیں جو پچھلے پانچ برس سے اس عہدہ پر فائز ہیں اور فروری ۹۲ء میں دوبارہ اس عہدہ پر منتخب ہوئے ہیں۔

بارک خان کے مدرسے میں تین گنبد کے نیچے مفتی اعظم کے دفتر میں میں جب

داخل ہوا تو مجھے مفتی اعظم کو دیکھ کر قدرے اچنبھا ہوا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مفتی صاحب' خاصے معمر شخص ہوں گے لیکن شیشہ چڑھی کشادہ میز اور خوبصورت سنہری اور روپہلی جلدوں والی کتابوں سے بھری الماریوں کے بیچ میں' چمڑے کی کرسی پر ۴۵ سالہ نوجوان مفتی اعظم بیٹھے تھے۔ نہایت وجیہہ نورانی چہرہ' چھوٹی سی سیاہ ڈاڑھی سر پر فر کی اونچی باڑھ والی وسط ایشیا کی روایتی ٹوپی' قمیص کا کالر کھلا ہوا' اس پر سویٹر اور اس کے اوپر لمبا کالا کوٹ' انہوں نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں نے اپنی نشست سنبھالتے ہوئے دیکھا کہ میز پر کاغذات بڑے سلیقہ سے رکھے ہوئے تھے' سامنے لال چمڑے کا خوبصورت قلم دان اور خط داں رکھا ہوا تھا۔ بائیں جانب ایک چھوٹی سی میز پر دو ٹیلیفون رکھے تھے اور اوپر چوبی دروازہ پر عالم اسلام کا نقشہ آویزاں تھا۔

میں نے جب مفتی صاحب کو ان کے دوبارہ انتخاب پر مبارک باد پیش کی تو ان کے شگفتہ چہرے کی سرخی اور نمایاں ہوگئی۔

میں نے حاجی محمد صادق بن محمد یوسف سے پوچھا کہ آزادی کے بعد اب وسط ایشیا کے مسلم بورڈ کا اصل رول کیا ہے؟ حمد و ثنا کے بعد انہوں نے کہا کہ آزادی کے بعد اس علاقے کے مسلمانوں کے لیے نہایت درخشاں دور شروع ہوا ہے۔ مسلمانوں کو اب مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوگئی ہے اور اس دور میں مسلم بورڈ کا اولین فرض' اس علاقے میں اسلام کی تعلیم کو فروغ دینا ہے اور عالم اسلام کے ملکوں سے روابط قائم کرنا ہے۔ اس کے ساتھ مسلم بورڈ کا اہم ترین فرض وسط ایشیا کی آزادی کو مضبوط اور مستحکم بنانا ہے کیونکہ ہمیں داخلی دشمنوں کا بھی سامنا ہے اور سابق سوویت یونین کی دوسری جمہوریاؤں میں بھی ان عناصر کا مقابلہ کرنا ہے جو اسلام کے خلاف ہیں۔

میں نے مفتی صاحب سے پوچھا کہ انہیں اس وقت سب سے بڑی مشکل کیا

درپیش ہے؟ اس کے جواب میں مفتی اعظم نے کہا کہ کو ہمیں آزادی تو مل گئی ہے لیکن قیادت وہی پرانی ہے جس کا انداز فکر کمونسٹ ہے۔ نتیجہ یہ کہ حکومت میں ایسے عناصر ہیں جنہیں اسلام کے بارے میں صحیح علم نہیں اور نہ انہیں مسلم یک جہتی کے جذبہ کا احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ عناصر' دوسرے مسلم ممالک کے ساتھ' مسلم بورڈ کے تعلقات کو نہیں سمجھ پاتے بلکہ ان تعلقات کو وہ غلط نگاہ سے دیکھتے ہیں' اسی بنا پر مسلم بورڈ کی سرگرمیوں میں مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔

مفتی اعظم محمد صادق سے میں نے پوچھا کہ کیا یہ خبریں صحیح ہیں کہ مسلم بورڈ کے اس اجلاس میں' جس میں انہیں دوبارہ منتخب کیا گیا تھا بعض حلقوں کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ وسط ایشیا کے ایک مفتی اعظم کی جگہ ہر جمہوریہ میں اپنا اپنا الگ مفتی اعظم منتخب کیا جائے۔ مفتی اعظم نے کہا کہ جی ہاں یہ صحیح ہے کہ یہ تجویز ان عناصر کی طرف سے پیش کی گئی تھی جو وسط ایشیا کے مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنا چاہتے ہیں لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

میں نے مفتی اعظم سے پوچھا کہ مغرب میں بعض عناصر کی طرف سے یہ تشویش ظاہر کی جا رہی ہے کہ وسط ایشیا کی مسلم جمہوریاؤں کی آزادی کے بعد نیل کے ساحل سے لیکر خاک کاشغر تک یہ پورا مسلم علاقہ متحد ہو کر ایک زبردست سیاسی قوت بن کر ابھر رہا ہے تو اس تشویش کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے؟

مفتی اعظم محمد صادق نے اس بات پر سخت ناراضگی ظاہر کی کہ جب بھی دو یا تین مسلمان یک جا ہوتے ہیں تو ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے جاتے ہیں۔ آج جب روس مغرب کے فوجی معاہدے نیٹو میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کرتا ہے تو اسے تاریخی ضرورت قرار دیا جاتا ہے۔ جب یورپ کے وسیع تر اتحاد کی بات کی جاتی ہے تو اس کی بڑی تعریف کی جاتی ہے لیکن جب مسلم ممالک اپنے باہمی تعلقات استوار کرتے ہیں تو اسے دنیا کے امن اور ترقی کے لیے خطرہ قرار دیا جاتا ہے۔

میں نے مفتی اعظم سے پوچھا کہ کیا ان کا اور ان کے مسلم بورڈ کا مقصد ازبکستان میں اسلامی مملکت قائم کرنا ہے؟ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہمارا اولین مقصد بلاشبہ یہ ہے کہ ہمارے سارے قوانین اور حکومت کے کام' اسلام اور قرآن پاک کی تعلیمات کے مطابق ہوں لیکن اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام کو صحیح معنوں میں اسلام کی تعلیم دی جائے۔ انہیں دین کے بارے میں بتایا جائے کیونکہ ایسے معاشرے میں جہاں لوگ بخوبی دین سے واقف نہ ہوں' شریعت کا علم نہ رکھتے ہوں اور قرآن پاک کی تعلیمات سے انہیں پوری طرح شناسائی نہ ہو وہاں شریعت کا نفاذ مشکل ہے۔

مفتی اعظم کا کہنا تھا کہ بعض عناصر کی طرف سے اسلامی شریعت کے نفاذ کو سیاسی کھیل بنانے کی کوشش کی جارہی ہے اور مسلم بورڈ پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ ہم ملک کی فضا ہموار کیے بغیر اسلامی شریعت کے نفاذ اور اسلامی مملکت کے قیام کا اعلان کر دیں۔ لیکن یہ خطرناک سیاسی کھیل ہے جس میں ہم ملوث ہونے کے لیے تیار نہیں۔

ازبکستان کی آزادی کے بعد ابھی نیا آئین مرتب اور منظور نہیں ہوا ہے لیکن صدر اسلام کریموف واضح طور پر کہہ چکے ہیں کہ نیا آئین ترکی کے طرز پر سیکولر ہوگا اور وہ پہلے ہی مذہبی بنیاد پر سیاسی جماعتوں کی تشکیل اور تنظیم پر پابندی عائد کر چکے ہیں۔ لیکن ازبکستان کے ممتاز دانشور خال مرزا سیف تاش مرزا کا خیال ہے کہ ملک میں مسلم بنیاد پرستی کا کوئی خطرہ نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں سو (۱۰۰) فیصد خواندگی ہے۔ لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ اور بڑی حد تک ہمارے ہمسایہ ملک اس معاملہ میں ہم سے بہت پیچھے ہیں۔ میرے خیال میں ان علاقوں میں ہمیشہ بنیاد پرستی کا خطرہ رہتا ہے جہاں صنعت کی ترقی کم ہے اور تہذیب اور ثقافت کو فروغ حاصل نہیں۔ جہاں پڑھے لکھے لوگ ہوں گے وہاں بنیاد پرستی کا خطرہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں پچھلے ستر سال کا اثر اچھا ہوا ہے۔ ہم جنونیت کی حد تک نہیں جاسکیں گے اس کے لیے تو ہمیں بالکل اندھا ہونا پڑے گا۔

خال مرزا سیف تاش مرزا کے برعکس' ازبکستان کے ممتاز شاعر ارکن واحدوف کو بنیاد پرستی کے رجحان کے ابھرنے کا خطرہ ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اسلامی بنیاد پرستی کا خطرہ اس وجہ سے بہت زیادہ ہے کہ اب بھی ہمارے ہاں مذہب کو دبایا جارہا ہے۔ جب بھی کسی نظریہ یا مذہبی تصور کو دبایا جاتا ہے تو یہ ربر کی طرح ابھر کر آتا ہے۔ بلاشبہ عوام ہمارے ہاں آج کل مساجد بنا رہے ہیں۔ ان کا مذہب کی طرف رجحان ہے اور وہ اپنے مذہب کے بارے میں زیادہ جاننا چاہتے ہیں۔ اگر اس معاملہ میں عوام کو پوری آزادی ہو تو پھر مذہبی کٹرپن نہیں ابھرے گا۔

میں جب مفتی اعظم حاجی محمد صادق محمد یوسف سے ملاقات کے بعد بارک خان کے مدرسہ کی عمارت سے باہر آیا تو دیکھا کہ حجاب پہنے اور ہاتھ میں سپارے لیے کم سن بچیوں کا ایک غول' تیراہے پر سینما گھر کے سامنے سے ہوتا ہوا عقب میں واقع امام بخاری ٹرسٹ کی عمارت کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں شام کو لڑکیوں کو دینی تعلیم دی جاتی ہے۔

میں تو اس سے پہلے وسط ایشیا نہیں آیا لیکن جنہوں نے یہاں کمونسٹ دور دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے ایسا منظر اس سے پہلے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔

باب ۹

بابر کی جنم بھومی

میری بیوی محسنہ کی ایک پھوپھی علی گڑھ میں ایک ازبک غیاث الدین ترسون بائیف سے بیاہی تھیں۔ غیاث الدین صاحب کے والد روسی ترکستان کے شہر نامن گان کے رہنے والے تھے۔ کمونسٹ انقلاب کے دوران وہ مزاحمتی تحریک میں شامل تھے اور جب مزاحمتی تحریک ۲۰ء میں ناکام ہو گئی تو وہ اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان آ گئے تھے اور علی گڑھ میں آباد ہو گئے تھے۔ یہیں جلا وطنی کے عالم میں ان کا انتقال ہو گیا۔

اتفاق سے ان کے صاحبزادے غیاث الدین صاحب کی ۶۰ء میں سوویت یونین کے ایک سفارت کار سے ملاقات ہوئی تھی جن کا تعلق غالباً ازبکستان ہی سے تھا۔ سوویت سفارت کار نے غیاث الدین صاحب کو آخرکار اپنے وطن لوٹنے پر آمادہ کر لیا اور وہ ۳۰ سال ہوئے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ازبکستان میں اپنے آبائی شہر نامن گان منتقل ہو گئے۔ ایک عرصہ تک وہ تاشقند ریڈیو سے منسلک رہے اور گیارہ برس ہوئے وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ محسنہ کی پھوپھی سرفراز بیگم اور ان کے بچے جو اب ماشاء اللہ جوان ہو گئے ہیں نامن گان ہی میں رہتے ہیں۔

وسط ایشیا کے سفر پر روانہ ہوتے وقت محسنہ نے سرفراز بیگم کا پتہ لکھوا دیا تھا کہ اگر موقع ملے تو میں ان سے مل آؤں۔

نامن گان میں ویسے بھی تین وجوہ کی بنا پر جانے کا خواہاں تھا۔۔۔۔ ایک تو اس بنا پر کہ یہ ہندوستان میں مغلیہ دور کے بانی، ظہیر الدین بابر کا آبائی شہر ہے اور اسی سرزمین پر انہوں نے آنکھ کھولی تھی۔ دوسرے یہ شہر تاریخ کے اہم نشان کے ساتھ ساتھ اب آزاد ازبکستان کا اہم اقتصادی مرکز بھی بن گیا ہے کہ اس کے قریب ہی جہاں "سیر" اور "نارا" دریا آپس میں ملتے ہیں، بڑی تعداد میں تیل نکلا ہے۔۔۔ تیسرے نامن گان، ازبکستان میں تیزی سے ابھرتی ہوئی اسلامی تحریک کا مرکز ہے۔

میں نے جب تاشقند کے صحافی دادا خاں نوری سے نامن گان جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ کھل اٹھے۔ کہنے لگے کہ واہ یہ تو میرا آبائی شہر ہے۔ میں وہیں پیدا ہوا، وہیں پلا بڑھا اور اب بھی میرے سارے بھائی بہن وہیں رہتے ہیں۔ چلئے میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں۔ بس رات ہی کھانے کے بعد روانہ ہوتے ہیں۔ کار سے پانچ گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔

رات گئے جب دادا خاں نوری کی روسی کار، نامن گان جانے والی شاہراہ پر فراٹے بھرتی جا رہی تھی تو مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ہم یوں آناً فاناً پانچ سو کلومیٹر دور فرغانہ وادی میں بابر کے آبائی شہر کی سمت جا رہے ہیں۔ روزنامہ جنگ کراچی کے نیوز ایڈیٹر نصیر ہاشمی بھی ہمارے ساتھ ہو لیے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ تاشقند سے نامن گان کا راستہ بے حد خطرناک ہے کیونکہ سڑک پر پیچ پہاڑوں اور دروں سے گذرتی ہے اور کسی نے کہا تھا کہ اب بھی وہاں سخت برف باری ہو رہی ہے۔

میں نے جب اپنا یہ خوف نصیر ہاشمی سے بانٹنے کی کوشش کی تو دادا خان نوری، قہقہہ لگاتے ہوئے بولے کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو اس خطرناک راستے سے لے جانے کے بجائے، تاجکستان سے ہوتے ہوئے دوسرے راستہ سے نامن گان لے جا رہا ہوں۔

شاہراہ صاف ستھری تھی اور غالباً پیٹرول کی شدید قلت کی وجہ سے بالکل سونی۔ نجی کار کہیں نظر نہیں آتی تھی البتہ اکا دکا مال بردار ٹرک راستے میں آتے جاتے

دکھائی دیتے تھے۔

ازبکستان اور تاجکستان کی سرحد پر بس ایک چھوٹی سی چنگی نما چوکی تھی۔ وہاں صرف تین چار سپاہی تعینات تھے' جنہوں نے نہ پاسپورٹ مانگا اور نہ ویزا دیکھا۔ غالباً یہ داوا خاں نوری کو جانتے تھے۔

تاجکستان کے علاقے میں بائیں جانب ریگستان تھا اور دائیں جانب' مشہور اور بڑا صنعتی شہر لینن آباد تھا جو روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

یہ داوا خاں نوری کی روسی کار کا کمال تھا' ان کی لاجواب ڈرائیونگ تھی کہ تاجکستان کے علاقے میں کئی میل تک سڑک بڑے بڑے پتھروں اور گڑھوں سے اٹی پڑی تھی لیکن بغیر کسی بریک ڈاؤن یا حادثے کے ہم خیریت کے ساتھ اس سنگلاخ پل صراط سے گذر گئے۔

ہم سحری کے وقت دریائے سیرپار کرکے نامن گان میں داخل ہوئے۔ داواخان نوری کا آبائی مکان' شہر کے آخری سرے پر اس جگہ ہے جہاں سے کپاس کے کھیت شروع ہوتے ہیں۔

اونچی دیواروں والے احاطہ کے بڑے سے پھاٹک سے جب ہم داواخان نوری کے مکان میں داخل ہوئے تو دیوان خانے میں ان کے بھائی فرشی میزوں پر سجی سحری پر ہمارے منتظر تھے۔ پہلے لسی' پھر پنیر کے قتلے اور پھر پلاؤ۔ اس کے بعد محلّہ کی مسجد سے اذان تک خشک میوے اور چائے کا سلسلہ جاری رہا۔

محلّہ کی مسجد ہے تو پرانی لیکن نئی لگ رہی تھی کیونکہ اس میں حال میں توسیع ہوئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مسجد بھری ہوئی تھی جس میں نوجوان اور کمسن بچے نمایاں تھے جو بڑی حیرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ غالباً انہوں نے پہلی بار اجنبیوں کو اس مسجد میں دیکھا تھا۔

داوا خاں نوری کے بھائی بتا رہے تھے کہ نامن گان میں آزادی کے بعد نئی مساجد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور درس قرآن کے مدرسوں میں نوجوان طالب علموں

کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ تو کیا یہ احیاء اسلام ہے؟۔

امام دلاور خاں کہہ رہے تھے کہ نہیں اسلام تو یہاں کبھی ختم ہی نہیں ہوا۔ امام دلاور خان کا کہنا تھا کہ اب تک اسلام گھروں کی چاردیواری میں نہ صرف برقرار رہا ہے بلکہ فروغ پاتا رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مسلمان اب کھلم کھلا اپنے مذہبی فرائض انجام دے رہے ہیں اور پہلے سے اچھے مسلمان بننے کے لیے کوشاں ہیں۔

نامن گان میں "عدالت" کے نام سے ایک تنظیم بھی ابھری ہے۔ اس کے سربراہ رستم جان نوجوانوف ہیں جن کا کہنا ہے کہ یہ تنظیم معاشرہ کی اصلاح کے لیے سرگرم عمل ہے۔ "عدالت" گمراہ نوجوانوں کو اور ان لوگوں کو جو جرائم کی طرف مائل ہیں اپنی حراست میں لے کر مساجد کے حوالے کر دیتی ہے جہاں انھیں دینی تعلیم دی جاتی ہے اور قرآن پاک پڑھایا جاتا ہے تاکہ ان میں مذہب کی روشنی پیدا ہو اور یہ راہ راست پر آ جائیں۔

نامن گان' تاشقند سے دور اور قدرے کٹا ہوا ہے لیکن اس کی اس اعتبار سے بے حد اہمیت ہے کہ ایک طرف مشرق میں قزاقستان کی سرحد قریب ہے' جنوب میں کرغیزستان نزدیک ہے اور مغرب میں تاجکستان ملا ہوا ہے۔ یہاں اسلامی تحریک کا فروغ بلاشبہ پڑوس کی تینوں جمہوریاؤں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

نامن گان کا شہر خاصا بڑا۔ اور بے حد خوبصورت ہے۔ چاروں طرف مضافات ہیں اس کے' پرانی بستیاں اور تنگ گلیوں والے محلے آباد ہیں' شہر کے وسط میں جہاں حاکم کے دفاتر' بازار اور دوسرے تجارتی اور صنعتی ادارے ہیں' عمارتیں جدید اور کشادہ سڑکیں ہیں جن کے دونوں طرف سرو اور صنوبر کے درخت ہیں۔ حاکم کے دفتر کے سامنے عالی شان عمارت' پرانی کمونسٹ پارٹی کی ہے جس میں اب صدر' اسلام کریموف کی نئی پارٹی' پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کے دفاتر ہیں۔

نامن گان دریائے سیر کے کنارے آباد ہے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر بابر کے والد' عمر شیخ مرزا کا قلعہ تھا جہاں اب نشان مٹی کے ایک پہاڑ کی صورت میں رہ گیا

ہے۔ ویسے اس پہاڑ میں محرابوں اور طاقوں کے آثار اب بھی نظر آتے ہیں۔ اس تاریخی قلعہ میں ظہیر الدین بابر پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر تک انہوں نے اس قلعہ میں پرورش پائی لیکن جب ان کے والد' اس قلعہ کی دیوار سے گر کر دریائے سیر میں ڈوب گئے تو وہ اپنے ننھیال منتقل ہو گئے۔ اور پھر ان کی تقدیر انہیں فتوحات کے جلو میں ہندوستان لے گئی۔ سیر اور کارا دریاؤں کی وادی نے جس مغل بچے کو اپنی گود میں پالا تھا' گنگا اور جمنا کی وادی نے اسے اپنے تاج دار کے طور پر تسلیم کیا۔

عمر شیخ مرزا کے اس قلعہ سے ذرا دور جہاں سیر اور کارا دریا آپس میں ملتے ہیں' تیل کا ایک بڑا ذخیرہ دریافت ہوا ہے اور رمضان المبارک کے آغاز سے ذرا پہلے یہاں سے تیل نکالنے کا کام شروع ہوا ہے۔

دادا خان نوری یہ جگہ دکھانے کے لیے سخت بے تاب تھے۔ اس جگہ جہاں تیل کا کنواں کھودا گیا ہے ایک طرف کالے تیل کی بڑی سی جھیل بن گئی ہے جس میں سے بڑے بڑے ٹینکر تیل نکال کر' تیل صاف کرنے کے کارخانے لے جا رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے غیر متوقع طور پر اچانک اتنا زیادہ تیل نکلا ہے کہ اس کو ذخیرہ کرنے اور ریفائنری تک پہنچانے کا بروقت انتظام نہیں کیا جا سکا۔

تیل کی اس کالی جھیل کو دیکھ کر دادا خاں نوری کی آنکھیں چمک اٹھیں اور ان کی باچھیں ایسے کھل گئیں جیسے یہ سونے کی جھیل ہے۔ اور واقعی ازبکستان کے لیے یہ تیل' سونے سے کم نہیں۔۔۔۔ سونا تو اس کی زمین میں پہلے ہی بہت ہے جو ہر سال دو ارب ڈالر کی مالیت کا نکلتا ہے۔ تیل کی البتہ اس کے ہاں بہت کمی تھی جس کے لیے اسے باہر کے ملکوں پر تکیہ کرنا پڑتا تھا۔

اس علاقہ میں تیل نکالنے کے کام کے سربراہ' حق قلو قیوم جان کہہ رہے تھے کہ ازبکستان کی آزادی کے بعد یہ قدرت کا ایک تحفہ ہے جس پر ازبک عوام کو ہمیشہ فخر رہے گا۔

مجھے نامن گان میں محسنہ کی پھوپھی' سرفراز بیگم کا پتہ تلاش کرنے اور ان کے

ملنے کی بے تابی تھی لیکن دادا خاں توری اپنے بھائیوں سے مجھے ملوانا چاہتے تھے اور ان کے بھائیوں کا اصرار تھا کہ افطاری اور رات کے کھانے سے پہلے وہ کہیں اور نہیں جانے دیں گے۔

یوں رات گئے ہم سرفراز بیگم کے مکان کی تلاش میں نکلے۔ جس محلّہ کا میرے پاس پتہ تھا جب ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ کسی دوسرے محلّہ میں منتقل ہو گئی ہیں۔ ابھی ہم اسی کشمکش و پیچ میں تھے کہ کیا کیا جائے ایک بڑے میاں ہماری مدد کو آئے اور انہوں نے کہا کہ وہ ہمیں سرفراز بیگم کے نئے پتے پر لے جائیں گے۔ اور جھٹ پٹ وہ اپنے ساتھ ہمیں گلی در گلی لے گئے اور ایک بڑے پھاٹک کے سامنے پہنچا دیا اور کہا کہ یہی ہے اس شہر کے واحد ہندوستانی خاندان کا گھر۔

میں ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکا۔ غیاث الدین ترسون باشیف جب علی گڑھ میں تھے تو سب انہیں ازبک کہتے تھے اور غیر ہندوستانی سمجھتے تھے لیکن ستم ظریفی یہ کہ یہ جب اپنے وطن واپس آئے تو یہاں ان کے خاندان کو ہندوستانی کہا جاتا ہے۔

دروازہ کھٹکھٹا کر جب ہم مکان میں داخل ہوئے تو خاص انداز کا گھر نظر آیا۔۔۔۔ بیچ میں باغ اور چاروں طرف دالان والے کمرے۔ احاطہ میں تین الگ الگ مکان تھے۔ تینوں بھائیوں کے۔ مہمانوں کو بٹھانے اور ان کی خاطر تواضع کا بھی انداز خاص ازبک تھا۔ اسی طرح سے دعا' اسی طرح کے نان توڑنا اور وہی دہی' ملھی کریم اور دوسرے میوے۔

سرفراز بیگم' محلّہ میں کسی کے پرسے کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ اس دوران ان کے بیٹوں' واثق' عامر اور اسلم سے ملاقات ہوئی اور ان کے ساتھ ان کی ازبک بیویوں سے۔

میں نے واثق سے جن کا پورا نام انور ترسون باشیف ہے' پوچھا کہ آج کل وہ کیا کرتے ہیں؟ واثق نے جواب دیا کہ میں یہاں ایک دکان میں ڈائریکٹر ہوں۔ کوئی پندرہ سولہ سال سے وہاں کام کر رہا ہوں' شادی یہیں ہوئی' تین بیٹے ہیں میرے۔ ہم

یہاں پانچ بھائی اور ایک بہن، اپنی والدہ کے ساتھ رہتے ہیں۔

میں نے پوچھا کہ جب وہ علی گڑھ سے یہاں آئے تھے تو کیا عمر ہوگی ان کی۔

واثق نے بتایا کہ ۱۳ سال عمر تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جب ہم یہاں آئے تو یہ ہمارے لیے بالکل نئی دنیا تھی۔ اجنبی ہر لحاظ سے، ہمیں نہ تو روسی آتی تھی اور نہ ازبک زبان، اور ہم یہاں کسی کو جانتے بھی نہیں تھے۔ گزارہ پھر کیسے ہوا میں نے پوچھا۔ واثق نے کہا کہ بس، ہاتھ کے اشاروں سے بات ہوتی تھی لیکن بہت جلد میں روسی بھی جان گیا اور ازبک بھی۔۔۔ تو یوں آپ کو ایک ساتھ دو زبانیں سیکھنی پڑیں یہاں۔ میں نے پوچھا۔ واثق نے کہا کہ جی ہاں ایک ساتھ دو زبانیں سیکھنی پڑیں۔ میں جب یہاں اسکول میں گیا تو میں ۱۳ سال کا تھا لیکن مجھے پہلی جماعت میں رکھا گیا۔ جس میں سات سال کے بچے جاتے ہیں۔۔۔ شروع شروع میں عجیب سا لگتا تھا لیکن کیا کیا جاتا۔۔۔ زبانیں تو سیکھنی ہی تھیں۔ اب خدا کا شکر ہے روسی اور ازبک کے علاوہ دو تین اور زبانیں بھی جانتا ہوں۔

تو گھر میں تو آپ اپنی والدہ سے اردو میں بولتے ہوں گے؟ میں نے پوچھا۔ واثق نے کہا جی ہاں میں اور میرے سب بھائی بہن، اپنی والدہ سے اردو ہی میں بات کرتے ہیں۔ بس یہاں ہمارے ہی گھر میں اردو بولی جاتی ہے۔

اور بیوی بچے۔ میں نے پوچھا۔ واثق نے کہا کہ میری بیوی اور بچے صرف روسی اور ازبک جانتے ہیں اور گھر میں ازبک ہی بولتے ہیں۔ واثق نے بتایا کہ پچھلے دنوں میں علی گڑھ گیا تھا اور وہاں ۱۵-۲۰ دن رہا۔ جب میں واپس آیا تو میں اپنے بچوں اور بیوی کے ساتھ اردو میں بولنے لگا۔ بیوی کہنے لگی کہ "ہائے کاہے کے لیے تو اردو بول رہا ہے۔ تو تو یہاں ہے ازبکستان میں۔ وہاں ہندوستان میں تھوڑی ہے۔"

میں نے واثق سے پوچھا کہ ازبکستان کی آزادی کے بارے میں آپ اور دوسرے ازبک نوجوان کیا سوچتے ہیں۔ واثق نے بلا کسی توقف کے کہا کہ ہم سب بے حد خوش ہیں اس آزادی پر۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ اب باہر کی دنیا کے لیے

راستے کھلیں گے۔ میں تو دکان کا ڈائریکٹر ہوں۔ اس لحاظ سے میں خوش ہوں کہ راستے کھلنے سے بہت فائدہ ہوگا۔ باہر کی دنیا سے سامان آئے گا اور یہاں کا سامان باہر کی دنیا جائے گا۔

تو کیا آپ کو موقع مل جائے گا۔ نجی دکان کھولنے کا؟۔ میں نے سوال کیا۔ "یہ بات ہو رہی ہے' حکومت والے کہہ رہے ہیں کہ اب جو چاہے نجی دکان کھول سکتا ہے اور کاروبار شروع کر سکتا ہے۔ لیکن اس وقت سب سے بڑا مسئلہ سرمایہ کا ہے۔ ہمارے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ ہم خود اپنے آپ کاروبار شروع کر سکیں۔ ہاں دو تین سال لگیں گے اس میں۔" واحق نے بڑی پر امیدی کے ساتھ جواب دیا۔

اس دوران' واحق کی والدہ بھی آ گئیں۔ ہم سب سے مل کر بے حد خوش ہوئیں۔ اور خوب خاطر تواضع کی۔ میں نے ان سے جاننا چاہا کہ جب وہ پہلے پہل ازبکستان آئی تھیں تو انہوں نے کیسا محسوس کیا تھا اس نئی اجنبی سرزمین میں جہاں کی وہ زبان بھی نہیں جانتی تھیں۔

سرفراز بیگم نے بتایا کہ "میں شروع شروع میں بالکل باہر نہیں نکلتی تھی۔ میں بس اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی تھی اور ان سے ہی بات کرتی تھی۔ اس زمانے میں ہم حمزہ محلّہ کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے جو حکومت نے ہمیں دیا تھا۔ پڑوسی ہمارے ہم سے روسی میں بات کرتے تھے۔ میں کچھ بھی نہیں سمجھتی تھی بس ہوں ہاں کر دیتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ روسی زبان سیکھ گئی۔ بچوں نے بہت جلد یہاں کی زبانیں سیکھ لیں اور پھر انہی سے میں بھی روسی اور ازبک سیکھ گئی۔ اب بھی میں ازبک اچھی طرح سے نہیں بول پاتی' آدھی اردو اور آدھی ازبک بولتی ہوں۔ لیکن سب میری بات سمجھ جاتے ہیں اور میں سب کی باتیں سمجھ لیتی ہوں۔

اور روسی میں نے پوچھا۔ سرفراز بیگم نے جواب دیا سمجھ لیتی ہوں بولتی نہیں۔

اچھا' کھانا وغیرہ تو یہیں کا ازبکی بناتی ہیں آپ؟ سرفراز بیگم نے جواب دیا ہاں عام طور پر ازبکی کھانا بنتا ہے ہمارے ہاں۔ ویسے کبھی کبھی "اپنا" کھانا بھی بنا لیتی ہوں۔

میں نے پوچھا۔ کوفتے وغیرہ؟ کہنے لگیں سل بٹا تو یہاں ہے نہیں۔

مجھے یاد آیا، سرفراز بیگم علی گڑھ میں پان بہت کھاتی تھیں اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ پان وان نہیں ملتا یہاں۔ وہ بولیں، نہیں پان نہیں ملتا یہاں بس سگریٹ وگریٹ سے کام چلا لیتی ہوں۔

ان کے اس اعتراف پر۔ ان کے بچوں نے زور دار قہقہہ لگایا۔ اور پورا گھر زعفران زار بن گیا۔۔۔ مجھے اچانک علی گڑھ کے ترکمان دروازے میں ان کا حویلی نما مکان یاد آگیا جو اب سونا ہو چکا ہے اور لکھیا اینٹوں کی فصیل نما دیواریں اپنے پرانے باسیوں کی فرقت میں، خستہ ہو ہو کر ڈھتی جا رہی ہیں۔

باب ۱۰

بند معاشرے سے کھلے معاشرہ کی طرف

نامن گان سے جب ہم تاشقند کے لیے روانہ ہوئے تو بہت رات ہو چکی تھی۔
نامن گان آتے وقت بھی رات تھی اور واپسی بھی رات میں ہو رہی تھی' اس لیے فرغانہ وادی کو دن کے اجالے میں دیکھنے کی حسرت رہی۔ البتہ مجھے اس بات پر خوشی تھی کہ مجھے اس سرزمین کو دیکھنے اور اس فضا کو محسوس کرنے کا موقع ملا جس کے رشتے' برصغیر سے بڑے پرانے ہیں اور جو اب ایک نئے انداز سے دوبارہ استوار ہو رہے ہیں۔۔۔ پھر یہ سرزمین' آزاد ازبکستان کے مستقبل کی آئینہ دار ہے' اقتصادی اعتبار سے بھی کہ یہاں تیل نکلا ہے اور سیاسی طور پر بھی۔

نامن گان میں اسلامی تحریک تیزی سے ابھر رہی ہے اور فروغ پا رہی ہے۔
ازبک صحافی داوا خاں نوری' جن کی فراٹے بھرتی ہوئی روسی کار میں ہم تاشقند واپس جا رہے تھے' کہہ رہے تھے کہ حال میں نامن گان میں "عدالت" نامی جو تنظیم قائم ہوئی ہے اس نے نوجوانوں میں ایک نئے انداز سے اسلامی جذبہ پیدا کیا ہے اور ان میں متصوفانہ عصبیت ابھار کی ہے۔۔۔ میں سوچ رہا تھا کہ مغرب میں بہت سے مبصر اس رجحان کو ابھرتی ہوئی "مسلم بنیاد پرستی" سے تعبیر کریں گے لیکن ستر سال کے کمونسٹ دور کے بعد بلاشبہ یہ عمل اپنی مذہبی روایات اور تاریخی ورثہ کو دوبارہ دریافت کرنے کی خواہش کا مظہر ہے اور یہ دراصل اپنے تشخص کو تلاش کرنے کی کوشش ہے۔
یہ بات بڑی تیزی سے مجھ پر واضح ہوتی جا رہی تھی کہ ازبکستان میں مستقبل کے

بارے میں دو الگ الگ سطحوں پر فیصلے ہو چکے ہیں ـــ حکومت کی سطح پر یہ طے کر لیا گیا ہے کہ ازبکستان کا سیاسی نظام، سیکولر بنیادوں پر ترکی کے طرز پر ہو گا۔ حقیقت میں یہ کوئی نیا یا انقلابی فیصلہ نہیں کیونکہ، سیکولر نظام تو پہلے ہی پچھلے ستر سال سے جاری تھا، یہ فیصلہ اصل میں اس پرانے نظام کو جاری رکھنے کا اعادہ ہے۔

عوام کی سطح پر البتہ فیصلہ مختلف ہے۔ عوام نے کھلم کھلا فیصلہ اپنے اسلامی تشخص کے حق میں دیا ہے۔

مجھے یاد آیا، تاشقند میں امام بخاری انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ الحاج عبداللطیف نے ازبکستان کے نوجوانوں میں مذہب کے بڑھتے ہوئے شوق کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ امام بخاری انسٹی ٹیوٹ میں اس سال آٹھ سو سے زیادہ نوجوانوں نے داخلے کے لیے درخواست کی تھی جن میں سے صرف دو سو کو داخلہ دیا جا سکا کیونکہ انسٹی ٹیوٹ میں اتنے ہی طلبا کی تعلیم کی سہولت ہے لیکن انسٹی ٹیوٹ کے علاوہ ملک بھر میں مساجد اور مدرسوں میں دینی تعلیم کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

غالباً ازبک نوجوانوں میں مذہب سے بڑھتے ہوئے اس شوق کے پیش نظر بعض عناصر کی طرف سے ان میں خوف پیدا کیا جا رہا ہے ـــ تاشقند میں پاکستان کے تجارتی ادارے تکابی کارپوریشن کے کرتا دھرتا عباس خان کا کہنا ہے کہ نوجوان نسل، ماضی کی آزادی چاہتی ہے ـــ ماضی میں اگر ایک طرف سیاسی پابندی تھی تو دوسری طرف، ثقافتی طور پر آزادی تھی۔ نوجوانوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈالی جا رہی ہے کہ اگر وہ مذہب کی طرف راغب ہوئے تو پاکستان اور ایران کی طرح انھیں چار دیواری برقعوں اور پابندیوں میں بند کر دیا جائے گا۔ انھیں آپس میں ملنے نہیں دیا جائے گا، کوئی نئی کتاب پڑھنے نہیں دی جائے گی، کوئی رسالہ پڑھنے نہیں دیا جائے گا اور کوئی باہر کی فلم دیکھنے نہیں دی جائے گی۔ غرض اس وقت عجیب و غریب پروپیگنڈا جاری ہے جس میں مغرب کے پروپیگنڈے نے اور پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔

عجیب بات ہے کہ اس وقت جتنے بھی اخبارات ماسکو میں شائع ہو رہے ہیں ان میں اس قسم کے آرٹیکل شائع ہو رہے ہیں جن میں کہا جا رہا ہے کہ اس وقت ایران،

پاکستان اور ترکی کے درمیان اسٹرگل جاری ہے کہ سینٹرل ایشیا میں اپنا اثر پھیلانے کے لیے ایک دوسرے کو پچھاڑنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ایسا بالکل نہیں۔ پاکستان کی صرف ایک دو فرمیں کام کر رہی ہیں اس وقت۔ ایران کو لیں تو وہاں کی کچھ ایسی فرمیں کام کر رہی ہیں جن کا نام کسی نے سنا بھی نہیں۔ جہاں تک ترکی کا تعلق ہے۔ صحیح ہے کہ ترکی کی فرمیں یہاں کام کر رہی ہیں اور ان کا اقتصادی اثر پھیل رہا ہے۔ بنیادی طور پر پاکستان اپنے مسائل میں اس قدر الجھا ہوا ہے کہ اسے اس علاقہ کی طرف اس انداز سے توجہ دینے کی مہلت نہیں ملی ہے جس انداز سے اسے یہاں کام کرنا چاہیے تھا۔۔ ہاں پچھلے چند ماہ سے پاکستان کی حکومت اور پاکستانی اس علاقہ میں سرگرم ہوئے ہیں لیکن وہ کام جو انہیں تین چار سال پہلے کرنا چاہیے تھا انہوں نے نہیں کیا۔۔ ایران کے اپنے کچھ مسائل ہیں۔۔۔ دوسرے مذہبی حوالے سے وہ آذربائی جان میں زیادہ کام کر سکتا ہے بنسبت یہاں کے۔۔۔ ترکی کا البتہ اثر پھیل رہا ہے۔ لیکن ان تینوں ملکوں میں کوئی باہمی مقابلہ نہیں۔ اس بات کو اچھالا زیادہ جا رہا ہے۔

روسی نژاد تامیلا نکتنا' ایک عرصہ سے تاشقند میں رہتی ہیں اور یہاں یونیورسٹی میں اردو پڑھ رہی ہیں۔ میں نے دوسری باتوں سے پہلے ان سے پوچھا کہ انہیں اردو سے دلچسپی کیسے پیدا ہوئی۔؟ تامیلا نے بڑے فخر کے ساتھ کہا "میرا سارا خاندان اردو دان ہے۔ ہمارے والد صاحب اور والدہ۔ دونوں نے تاشقند یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں اردو پڑھی ہے۔ اس طرح بچپن ہی سے مجھے اردو سے دلچسپی رہی ہے۔ پھر ہم پانچ سال تک ہندوستان میں رہے' یوں میرا اور میری بہن کا ہندوستان اور اس کے ساتھ پاکستان سے بھی تعلق خاطر رہا ہے۔۔۔۔ اس وقت میں تاشقند یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پڑھتی ہوں۔ چوتھے سال کی طالبہ ہوں۔

تامیلا' ازبک معاشرہ میں کافی گھلی ملی ہوئی ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ازبک لڑکیاں نئی آزادی کے بعد کیا محسوس کرتی ہیں؟ "یہاں کچھ لڑکیاں ہیں جو یہاں ان اسلامی مدرسوں میں جو نئے کھلے ہیں پڑھنے جاتی ہیں۔" تامیلا نے کہا۔ "اب تو سڑکوں

پر یہاں ایسی لڑکیاں نظر آتی ہیں جو حجاب پہنتی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ حجاب یہاں فیشن کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ حجاب پہننے والی لڑکیوں کو اس بات کا احساس ہے کہ لوگ انہیں دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ارے واہ۔ یہ لڑکیاں تو برقع پہنے ہوئے جا رہی ہیں۔ لیکن ان لڑکیوں کو کچھ دنوں کے بعد محسوس ہو گا کہ ارے واہ یہ برقع تو اب ہمیں ساری عمر پہننا ہو گا اور اس سے چھٹکارا نہیں مل سکے گا۔

میں نے تامیلا سے پوچھا کہ ایک عام ازبک لڑکی اپنی زندگی کے بارے میں کیا سوچتی ہے اور اس کا نئے حالات میں انداز فکر کیا ہے؟۔۔ تامیلا نے جواب دیا کہ یہاں کی ازبک لڑکیاں بالکل اس روایتی انداز سے سوچتی ہیں جیسے کہ دوسرے اسلامی ملکوں میں لڑکیاں سوچتی ہیں۔۔ ان کو بچپن ہی سے صرف' شادی اور اپنا گھر بسانے کے بارے میں تیار کیا جاتا ہے۔۔ جو لڑکیاں کالج اور یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں وہ اپنا کیریر بنانے کے لیے نہیں پڑھتیں بلکہ وہ انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد کام نہیں کرتیں۔ بس شادی' واحد مقصد ہوتا ہے ان کا اور شادی کے بعد اپنے خاوند اور بچوں کی دیکھ بھال میں زندگی گزار دیتی ہیں۔

میں نے پوچھا کہ کیا ازبک لڑکے اور لڑکیاں آزادانہ طور پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں یا رکاوٹ ہے؟

تامیلا نے بتایا کہ اتنی آزادی نہیں۔ رکاوٹ ہے۔ شادی سے پہلے عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ والد اور والدہ' نوجوانوں کو ایک دوسرے سے متعارف کراتے ہیں۔ والدین کی نگرانی میں یہ ملتے ہیں اور اگر ایک دوسرے کی مرضی ہوتی ہے تو ان کا رشتہ طے کر دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ رواج' شہروں میں ہے۔ دیہات میں عام طور پر لڑکے اور لڑکیاں' شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھتے بھی نہیں۔ بالکل پاکستان اور ہندوستان کی طرح۔

بہرحال ازبکستان' اس وقت اپنی عمرانی تاریخ کے ایک اہم موڑ پر ہے جب کہ اس کا معاشرہ طویل کمونسٹ دور کے بعد آزادی کے نئے ان جانے دور میں داخل ہوا ہے۔ ازبکستان کے ممتاز دانشور' ڈاکٹر تاش مرزا کہتے ہیں کہ یہ مرحلہ بڑا نازک ہے

اور مشکلات سے بھرپور ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "یہاں ہماری سب سے بڑی پریشانی یا مشکل یہ ہے کہ ہم بالکل ایک 'بند' معاشرہ سے 'کھلے' معاشرے کی طرف جا رہے ہیں۔ اس لیے ہم جو بھی قدم رکھتے ہیں البتہ غلط رکھتے ہیں' یعنی دو قدم سے ایک آدھ قدم غلط نکلتا ہے۔ ہم ایک معاشرہ سے دوسرے معاشرہ میں منتقل ہو رہے ہیں۔۔ یہ ہماری نسل کے لیے بڑا مشکل ہے۔ اس میں سنبھلتے سنبھلتے وقت لگے گا۔

میں نے پوچھا کہ کیا نوجوان' ذہنی طور پر اس تبدیلی کے لیے تیار ہیں؟ ڈاکٹر تاش مرزا نے جواب دیا۔ نوجوان ذہنی طور پر تو تیار ہیں لیکن انہیں تبدیلی اور آئندہ کے بارے میں واقفیت بہت کم ہے۔

میں نے ڈاکٹر تاش مرزا سے سوال کیا کہ کیا یہاں لوگ یہ نہیں سوچتے کہ پچھلے اشتراکی نظام میں غلطیاں تھیں' اس کا انداز آمرانہ تھا' جمہوری عمل کی اس میں کمی تھی اور روس کی اس نظام پر اجارہ داری تھی لیکن مارکیٹ اکنامی کا نظام بھی کوئی معجزہ نہیں۔ اس میں بھی خطرات ہیں؟

ڈاکٹر تاش مرزا نے جواب دیا۔ "سمجھتے ہیں۔ بخوبی یہ بات سمجھتے ہیں۔ لیکن یہاں لوگوں کو یقین ہے کہ وسط ایشیا کی جو اخلاقی اقدار ہیں اور جو اسلامی قدریں ہیں وہ زیادہ کار فرما ہوں گی اس تبدیلی میں اور یوں نئے نظام کی برائیاں کچھ کم ہوں گی۔ یہ بات کسی سے چھپی نہیں کہ جب ہم اشتراکی نظام میں رہتے تھے تب بھی ماسکو اور تاشقند میں رہنے والے لوگوں کے ذہنوں میں اور ان کے انداز فکر اور طرز عمل میں بہت فرق تھا۔ یہاں خاندان زیادہ مضبوط ہے' زیادہ اتحاد ہے۔ پھر بڑوں کی زیادہ عزت اور احترام ہے۔ نوجوان' اپنے والدین کو چھوڑ کر نہیں چلے جاتے یا ان کی رائے کو بالکل نظرانداز نہیں کرتے۔ یہ ہماری اقدار ہیں۔

ڈاکٹر تاش مرزا کہہ رہے تھے کہ میں پھر بھی سمجھتا ہوں کہ اشتراکی نظام نے اور اشتراکی معاشرہ نے ہمیں یہاں بہت کچھ دیا ہے۔ یہ محض چند گنے چنے افراد کی رائے ہے کہ اس معاشرہ میں صرف برائیاں ہی برائیاں تھیں۔ یہ غلط ہے۔۔۔ وسط ایشیا میں اشتراکی نظام سے پہلے خواندگی صرف ۲ یا ۳ فی صد تھی۔ اب سو فی صد لوگ خواندہ

ہیں--- عورت اور مرد مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ یہاں' اب ہماری صنعت ہے اور بہت اچھی صنعت ہے۔ ہم نے کافی ترقی کی ہے۔ اس کو ہم نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اگر ہم کریں گے تو یہ ناشکری ہو گی--- ڈاکٹر تاش مرزا نے بڑے پرزور انداز سے کہا۔

ازبکستان کی دو کروڑ کی آبادی میں دس فی صد کے لگ بھگ روسی ہیں جو نہ صرف حکومت میں بلکہ صنعت اور تجارت کے شعبوں میں بھی اہم عہدوں پر فائز ہیں--- یہ ازبکستان کی آزادی کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟۔ تاملا سے میں نے پوچھا کہ آپ روسی ہیں آپ سے بہتر روسی انداز فکر کے بارے میں اور کون کہہ سکتا ہے۔ اس پر تاملا بولیں۔ "یہ اچھا سوال ہے لیکن میں تو یہاں چھ سات سال سے رہتی ہوں اور میں نہیں سمجھتی کہ میں اس جمہوریہ یا اس قوم سے الگ ہوں۔ میں پہلے بھی مشرق میں رہتی تھی ہندوستان اور بنگلہ دیش میں اور اب یہاں رہتی ہوں۔ مشرق کے لوگوں اور مشرقی ثقافت کے ساتھ میرا گہرا تعلق ہے--- میں اپنے آپ کو یورپی نہیں سمجھتی--- اور میری رائے یہ ہے کہ جو لوگ دوسری قوم کے ساتھ رہتے ہیں انہیں اس قوم کے کلچر اور روایات کی عزت کرنی چاہیے۔

میں نے پوچھا کہ مگر جو دوسرے روسی یہاں رہتے ہیں وہ کیا سوچتے ہیں؟ وہ کیا واپس چلے جائیں گے یا یہیں رہیں گے؟

تاملا نے کہا کہ یہاں رہنے والے بہت سے روسی ایسے ہیں جو واپس جانا چاہتے ہیں لیکن یہاں چونکہ مختلف قوموں کے درمیان اچھے روابط ہیں اس لیے یہ اتنی جلدی نہیں جانا چاہیں گے۔

میں نے پوچھا کہ کیا مطلب یہ کہ ابھی یہاں کشیدگی پیدا نہیں ہوئی---؟ "جی ہاں ابھی کشیدگی پیدا نہیں ہوئی" تاملا نے جواب دیا--- "تو خطرہ ہے اس کا؟" میں نے پوچھا۔ تاملا نے کہا کہ غالباً اس کا خطرہ دو سال پہلے بہت زیادہ تھا جب آزادی نہیں ملی تھی اور ازبک زبان کے لیے تحریک چلی تھی۔ اس تحریک کا مطالبہ تھا کہ ازبک

زبان کو سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ ازبک عوام یہ سمجھتے ہیں کہ ان پر روسی زبان مسلط کی گئی ہے۔ یہ قوم پرست جذبات کا ایک پرزور اظہار تھا۔

تامیلا بتا رہی تھیں کہ ازبکستان میں کچھ ایسے روسی ہیں جو نہ تو ازبک زبان سیکھنا چاہتے ہیں اور نہ ازبک تہذیب سے متعارف ہونا چاہتے ہیں۔"

ان روسیوں میں سے بہت سے یہیں پیدا ہوئے' پلے بڑھے کہ ان کے آباؤ اجداد سو سال پہلے زار روس کے تسلط کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ بہت سے ان میں ایسے ہیں جو کمونسٹ دور کے طفیل یہاں آئے اور یہیں بس گئے۔ اب یہ آزادی کے نئے دور کی آزمائش سے گزر رہے ہیں' انھیں ازبکستان کی ضرورت ہے اور ازبکستان کو ان کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی ازبکوں کی ایک بڑی تعداد اب بھی روس میں آباد ہے۔ یوں یہ تانے بانے ابھی برقرار ہیں۔

باب ۱۱

موت کا نشان جو موت کے حکم سے بچ گیا

بخارا کے چھوٹے سے ہوائی اڈے سے جب میں شہر کی سمت جا رہا تھا تو پتلی سی سڑک کے دونوں طرف ریت کے بے ہنگم ٹیلے دکھائی دیے اور ان کے پیچھے دور تک وہ کھیت تھے جو کپاس کی پے درپے فصلیں اگا اگا کر بدحال نظر آتے تھے۔۔۔ پھر ان سے پرے دور تک روسی انداز کے فلیٹوں کی عمارتیں کھڑی پرولتاری دور کی ناکامی کی یاد دلا رہی تھیں۔۔۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا یہ زرافشاں دریا کی وہی سرزمین ہے جس نے دنیا کی تہذیب و تمدن کی تاریخ کو شان و شوکت اور فخرو افتخار سے مالا مال کیا۔۔۔ اور کیا یہ پتلی سی سڑک' چین کو یورپ سے ملانے والی وہی۔۔۔ شاہراہ ریشم ہے جس پر واقع بخارا صدیوں تک علم و حکمت' فن و حرفت اور آرٹ اور ثقافت کا ایک درخشاں مرکز رہا ہے۔

لیکن جیسے ہی زرافشاں دریا پار کر کے جب میں شہر کے مضافات میں پہنچا تو سامنے صدیوں پرانے' دو بڑے بڑے میناروں کے بیچ میں ایک دروازہ نظر آیا۔ یہ بخارا کے چار دروازوں میں سے بچا ہوا ایک دروازہ ہے جو تاریخ کے آشوب اور موسم کے ستم جھیل کر بھی ڈٹا کھڑا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی اینٹوں پر مجھے رشک آیا کہ انہوں نے کیسے کیسے دور دیکھے ہوں گے۔ کیسے کیسے لوگوں کو دیکھا ہو گا' ان کی باتیں سنی ہوں گی۔ ان میں سے بہت سوں کی آرزوئیں پوری ہوتے دیکھی ہوں گی اور بہت سوں کی تمناؤں کی ناکامی کے درد کو محسوس کیا ہو گا۔۔۔ برابر ہی اس دروازہ کے

مسمار شدہ دیوار کا ایک حصہ ان سب باتوں کی شہادت دیتا نظر آتا تھا۔

بخارا محض چند صدیوں پرانا شہر نہیں۔ یہ تین سو تیس سال قبل مسیح میں بھی تجارت اور ثقافت کا اہم مرکز تھا جب یہاں سے سکندر اعظم گزرا تھا۔ کہتے ہیں اس شہر کا موجودہ نام' بودھوں کے زمانے میں پڑا تھا۔ یہاں بدھ مت کی ایک بڑی عبادت گاہ تھی جو "وہیارہ" کہلاتی تھی اور یہ نام بدلتے بدلتے پہلے "بے خارہ" اور پھر بخارا بن گیا۔

آٹھویں صدی تک یہ شہر زرتشتیوں کا اہم مرکز تھا۔۔ لیکن جب ۷۱۱ء میں ٹھیک؛ اس وقت جب محمدؒ بن قاسم بحیرہ عرب پار کر کے سندھ میں داخل ہوئے ایک اور عرب' جرنیل' قتیبہ ابن مسلم۔۔ آمو دریا پار کر کے وسط ایشیا میں داخل ہوئے اور دو برس کے اندر اندر یہ بخارا اور سمرقند فتح کرتے ہوئے' مشرق میں سنکیانگ میں کاشغر تک پہنچ گئے۔ یہ فوجی فتح تھی۔۔۔ لیکن درحقیقت اسلام کی روشنی اس سے کئی برس پہلے' رسولؐ اللہ کے ایک عم زادے حضرت قاسم بن عباس نے پھیلائی تھی۔

بخارا کی قدیم تاریخ کے اوراق ذہن میں الٹتا ہوا جب میں پرانے شہر کے مغربی سرے پر پہنچا تو دیکھا سامنے گہرے نیلے آسمان کے پس منظر میں خاکی اینٹوں کا بنا ہوا ایک خوبصورت چوکور مقبرہ کھڑا ہے' اپنی ایک نرالی آن بان کے ساتھ۔ مقبرہ سادہ اینٹوں سے اس ترتیب اور کاری گری سے سجا ہوا تھا کہ دیواریں' اینٹوں سے بنی ہوئی نظر آتی تھیں۔ قندیلیں بھی دیواروں میں اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں اور اوپر گنبد بھی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ کرشمہ ان اینٹوں کا یہ تھا کہ سورج کی روشنی کے ساتھ ساتھ ان کا رنگ بھی بدلتا نظر آتا تھا۔۔ معجزہ یہ کہ یہ مقبرہ چنگیز خان کے حملہ کی تباہی سے بچ گیا کیونکہ جس زمانے میں بخارا پر چنگیزی تباہی ٹوٹی اس وقت یہ مقبرہ ریت میں دبا ہوا تھا۔

یہ سامانی سلطنت کے چشم و چراغ' اسمٰعیل سامانی کا مقبرہ ہے۔

نویں صدی میں بخارا' سامانی سلطنت کا دارالحکومت تھا جس کی سرحدیں افغانستان میں ہرات تک اور ایران میں اصفہان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں

بخارا کی آبادی تین لاکھ تھی اور اس شہر میں ڈھائی سو دینی مدرسے تھے جہاں یمن اور اندلس ایسے دور دراز مقامات سے طالب علم دینی علم کی پیاس بجھانے آتے تھے۔ اس زمانے میں یہ محض دینی مرکز ہی نہیں تھا بلکہ سائنس اور دوسرے علوم کا بھی سرچشمہ تھا' کہتے ہیں کہ سامانی حکمران کے کتب خانے میں ۴۵ ہزار کتابیں تھیں اور اس زمانے میں بخارا' بغداد کے ہم پلہ مانا جاتا تھا۔

اسی کتب خانے سے حسین ابن عبداللہ ابن سینا نے فیض حاصل کیا تھا اور دنیا میں ابن سینا کے نام سے ایک فلسفی طبیب' ماہر نجوم' ریاضی دان' موسیقار اور شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

کہا جاتا ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر میں انہوں نے سامانی حکمران کے ایک پرانے مرض کا ایسا کامیاب علاج کیا کہ جس سے خوش ہو کر بادشاہ نے انہیں اپنے کتب خانے سے فیض حاصل کرنے کی اجازت دے دی تھی۔۔ پھر اسی کتب خانے میں ان کی اپنی تحریر کردہ کتابوں کا اضافہ ہوا۔ ابن سینا ہی نے سب سے پہلے ارسطو کا ترجمہ' عربی میں کیا اور انہوں نے ادویات کی مشہور کتاب "قانون" مرتب کی جو علم طب کی انسائیکلوپیڈیا تعبیر کی جاتی ہے۔ کئی سال تک ابن سینا سامانی دربار میں وزیر اعظم بھی رہے۔

اسمٰعیل سامانی کے مقبرہ کے قریب ہی بخارا کا کلاں مینار ہے۔ بارہویں صدی کا یہ مینار جو ڈیڑھ سو فیٹ بلند ہے' وسط ایشیا کا سب سے اونچا مینار مانا جاتا ہے۔اینٹوں سے بنے اس مینار کا اوپری حصہ بالکل روشنی کے مینار۔۔۔ لائٹ ہاؤس کی مانند ہے۔۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مینار اس زمانے میں قافلوں کی راہ نمائی اور ان کی نگرانی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ لیکن میری راہ نما نتاشا کا کہنا تھا کہ اور بھی مصرف تھے اس مینار کے۔

نتاشا کا کہنا تھا کہ ایک زمانے میں اس کلاں مینار کو ٹیکس ادا نہ کرنے والے افراد یا بادشاہ کے مخالفین کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ جسے

سزائے موت دی جاتی تھی اسے پہلے سیڑھیوں سے اوپر لے جایا جاتا تھا پھر اسے نیچے شہر کا آخری نظارہ کرایا جاتا تھا اور پھر اسے بوری میں بند کر کے نیچے گرا دیا جاتا تھا۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ سزائے موت کا یہ طریقہ بیسویں صدی کے اوائل تک جاری تھا اور زار روس کے دور میں بھی اس مینار کا یہ مصرف تھا۔

یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ بارہویں صدی میں جب چنگیز خان نے بخارا پر حملہ کیا اور تین روز تک محاصرے کے بعد شہر میں داخل ہوا تو وہ اس مینار کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ اس کے بعد اس نے اس مینار کے علاوہ بخارا کی تمام عمارتوں کو زمین بوس کر دینے کا حکم دیا۔ موت کے حکم سے موت کا یہ نشان بچ گیا۔ جو اب تاریخ کا ایک نشان رہ گیا ہے۔

کلاں مینار کے نزدیک ہی بخارا کا وہ تاریخی مدرسہ ہے جو "میر عرب" مدرسہ کہلاتا ہے۔ یہ تین سو سال پرانا ہے۔ اس کے بارے میں میری راہ نما تاشا نے بتایا کہ میر عرب واحد مدرسہ تھا جس میں کمونسٹ دور میں بھی دینی تعلیم کی اجازت تھی۔ اس زمانے میں اس مدرسہ میں صرف اسی (۸۰) طالب علموں کو داخلہ ملتا تھا لیکن دو ہفتے قبل اس مدرسے کے منتظمین نے بتایا کہ اس بار ڈھائی سو سے زیادہ طالب علموں کو داخلہ دیا گیا۔۔۔ ازبکستان کی آزادی کے بعد اب بخارا میں پرانے مدرسے دوبارہ کھل رہے ہیں۔ ان میں سترہویں صدی کا مدرسہ "نادر دیوان بیگے" بھی شامل ہے۔

میر عرب مدرسہ کے قریب ہی ایک خوبصورت مسجد ہے جو مسجد بالائے حوض کہلاتی ہے۔۔ یہ ۱۸ ویں صدی میں تعمیر ہوئی تھی جو اصفہان کی مشہور مسجد کے طرز کی ہے۔

بخارا کے مضافات میں ممتاز صوفی اور نقشبندی طریقہ کے بانی عالم دین حضرت بہاء الدین نقشبندی کا مزار ہے۔ چھ سو سال پرانا یہ مزار نہایت سادہ لیکن وسیع مسجد کے احاطہ میں ہے۔ اس احاطہ میں دو کنویں ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ

خود حضرت نقشبندی نے کھودے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔ میں جب ان میں سے ایک کنویں پر پانی کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا تو دیکھا کہ مسجد کے والان کے ایک کونے میں میری راہ نما تاتاشا' سر پر اسکارف ڈالے امام مسجد کے سامنے بڑے خضوع و خشوع سے دوزانو بیٹھی ہے اور امام صاحب اس کے لیے دعا مانگ رہے تھے۔

روسی نژاد عیسائی تاتاشا کی یہ عقیدت دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ جذبہ عقیدت' مذہب کی حدوں کو پھلانگ گیا تھا۔

بخارا نے چنگیز خان کی تباہی و بربادی ہی کا سامنا نہیں کیا بلکہ اس نے خود اپنے حکمرانوں کا ظلم و ستم بھی دیکھا ہے۔ ایسے ہی حکمرانوں میں بخارا کا ایک حکمران نصراللہ تھا جس کا طویل دور ۱۸۲۶ء میں شروع ہوا تھا۔ اقتدار اس نے اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی کو قتل کر کے حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے تین چھوٹے بھائیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تاکہ اس کے اقتدار کو کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔

امیر بخارا کا محل --- قلعہ نما ہے --- اس میں دربار میں داخل ہونے کا دروازہ اتنا چھوٹا بنا ہوا ہے کہ جو بھی دربار میں داخل ہوتا اسے جھک کر جانا پڑتا ---- کیا نرالا طریقہ اختیار کیا تھا اس زمانے میں امیر بخارا نے لوگوں کو اپنے سامنے جھکانے کا۔

تاریخ کی انتقامی جذبہ سے واپسی

بخارا اور سمرقند' ازبک عوام کے نزدیک دو حسین و جمیل بہنیں ہیں جو سجی دھجی' بنی سنوری' دلہنوں کی طرح کھڑی ہیں۔ ان دونوں شہروں کی عمارتوں کا طرز تعمیر ایک جیسا ہے جو برصغیر کی مغل دور کی عمارتوں سے بالکل ملتا جلتا ہے۔۔۔ بخارا اور سمرقند اب بھی فارسی بولنے والوں کے گڑھ ہیں۔۔ اور بخارا میں پرانے یہودیوں کی اب بھی بڑی آبادی ہے۔

سمرقند بھی بخارا کی طرح شاہراہ ریشم پر واقع ہے لیکن جب نئے سمندری راستوں کی وجہ سے اس شاہراہ کی افادیت ختم ہو گئی تو سمرقند بھی فراموش راستوں میں گم ہو کر رہ گیا۔۔۔ ۱۸۵۰ء تک چار صدیوں میں صرف دو یورپی سمرقند پہنچنے میں کامیاب رہے تھے۔

ایک طرف اس کے زرافشاں دریا ہے اور تین اطراف برف پوش تین شین پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ پہاڑ اس تاریخی شہر کے آثار کے پہرے پر متعین ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سمرقند' ڈھائی ہزار سال سے بھی پرانا شہر ہے جو اپنی تہذیب اور ثقافت کی بنا پر ایک زمانے میں مشرق کا روم کہلاتا تھا۔ پرانا نام اس شہر کا "مارا کنڈ" تھا جب یہ قدیم ایرانی سغدیانہ سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ ۳۲۲ قبل مسیح میں اسے سکندر اعظم نے فتح کیا تھا۔ ۷۱۲ء میں یہاں عرب فاتح آئے لیکن ۱۲۲۱ء میں چنگیز خان

نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

۱۴ ویں صدی میں اس شہر کی قسمت دوبارہ اس وقت جاگی جب تیمور لنگ نے اسے اپنی وسیع و عریض سلطنت کا دارالحکومت بنایا اور اسے وہ حسن و جمال اور شان و شوکت بخشی جس کے نشان اور آثار' صدیاں گزرنے کے بعد اب بھی تاباں ہیں۔

حسین و جمیل اور آب و تاب والی عمارتیں ہی نہیں' اس شہر نے امام بخاری ایسے محدث اور فقیہہ عطا کیے اور اسی شہر کی فضا میں رودکی' علی شیر نوائی اور جامی نے شعر کہے اور ممتاز ماہر نجوم اور سائنس دان الغ بیگ نے افراسیاب میں عالی شان رصدگاہ قائم کی اور اپنے علم کی بنا پر اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ الغ بیگ امیر تیمور کا پوتا تھا اور دراصل اسی نے سمرقند میں پہلا عظیم الشان مدرسہ قائم کیا تھا۔

رسولؐ اللہ کے عم زادے' حضرت قاسم بن عباس' جو اسلام کی روشنی لے کر وسط ایشیا آئے تھے' سمرقند ہی میں اس تاریخی قبرستان میں دفن ہیں جو "شاہ زندہ" کہلاتا ہے۔

سب سے پہلے میں نے حاضری' حضرت قاسم بن عباس کے مزار پر دی جو عقیدت مندوں کے ہجوم سے ہر وقت گھرا رہتا ہے۔ امیر تیمور نے اسی مزار کے ارد گرد اپنے رشتہ داروں کے مقبرے تعمیر کرائے جن میں تیمور کی ایک بھانجی کا نہایت خوبصورت مقبرہ بھی ہے۔۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بے حد حسین و جمیل لڑکی تھی جس کا سولہ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا۔

اسی کے قریب امیر تیمور کی ہمشیرہ کا مقبرہ ہے جو خوبصورت رنگ برنگے ٹائیلز کا حسین مرقع ہے۔ ایک مربع میٹر میں دو ہزار ٹائیلز سجائے گئے ہیں۔ رنگ ان ٹائیلوں کے وسط ایشیا کے نہیں بلکہ نہایت گہرے نیلے' ہرے اور سرخ رنگ کے ہیں۔

شاہ زندہ کے قبرستان میں عقیدت مند' داخل' اونچی سیڑھیوں سے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر کوئی اوپر چڑھتے وقت یہ سیڑھیاں گنے اور واپسی پر گنتی برابر نہ رہے تو یہ شخص گناہ گار مانا جائے گا اور اسے اس وقت تک ان سیڑھیوں پر چڑھنا اور اترنا چاہیے جب تک چڑھتے اور اترتے وقت ان سیڑھیوں کی گنتی برابر نہیں ہوتی۔

سمرقند کے عین وسط میں تاریخی چوک۔ ریگستان چوک ہے جس میں تین عالی شان اور نہایت حسین و جمیل مدرسوں کی عمارتیں ہیں جنہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان کسی اور دنیا میں پہنچ گیا ہو۔

میری روسی راہ نما تاشا نے بتایا کہ یہ مرکزی' ریگستان چوک' ۱۴ ویں صدی میں تیمور کے دور میں وسط ایشیا کا سب سے بڑا بازار تھا جہاں دنیا بھر سے تجارتی قافلے آتے تھے۔۔۔۔ اس کے چاروں طرف صناعوں اور کاری گروں کی دکانیں تھیں۔۔۔ ۱۵ ویں صدی میں تیمور کے پوتے الغ بیگ نے اس چوک میں سب سے پہلا مدرسہ قائم کیا تھا۔ الغ بیگ اس زمانہ کا مانا ہوا فلسفی' ریاضی دان' سائنس دان اور ماہر نجوم تھا۔ الغ بیگ خود اس مدرسہ میں پہلا استاد تھا۔

ایک صدی بعد بالکل ایسا ہی ایک اور مدرسہ' اس کے بالمقابل' سمرقند کے حکمران یالانگ دوش بہادر نے تعمیر کرایا تھا۔ الغ بیگ کے مدرسے کے نیلے گنبد تو سفاک موسم کے ہاتھوں مسمار ہو چکے ہیں لیکن یالانگ دوش بہادر کے مدرسہ کے نیلے گنبد اب بھی باقی ہیں اور ان کی چمک بھی۔

اونچے' منقش دروازوں' محرابوں' اور ستونوں والا یہ مدرسہ "شیر در مدرسہ" کہلاتا ہے' غالباً اس بنا پر کہ اس کے عالی شان دروازے پر شیر بنے ہوئے ہیں جو ہرنوں کا تعاقب کر رہے ہیں اور اوپر نئی سورج چمک رہے ہیں۔۔۔۔ مذہبی مدرسہ کے دروازے پر ان کا کیا جواز ہے؟ اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں۔

ریگستان چوک کی تیسری جانب' طلا کاری مدرسہ ہے۔ یہ ۱۷ ویں صدی میں تعمیر ہوا تھا۔ اس مدرسہ کے بیچوں بیچ نیلے گنبد والی سمرقند کی جامع مسجد ہے جس کے اندر سونے کی پچی کاری ہے۔ اسی مناسبت سے اسے طلا کاری مدرسہ کہا جاتا ہے۔

اس جامع مسجد کے مینار' الگ الگ جھکے ہوئے تھے اور صدیوں سے یونہی کھڑے تھے۔۔۔ ۱۹۳۲ء میں اور اس کے بعد ۱۹۶۵ء میں انہیں سیدھا کر دیا گیا۔ روسی' ماہرین اور سمرقند کے معماروں کو اس کارنامے پر فخر ہے۔۔۔ لیکن وہ یہ راز نہ پا سکے کہ مسجد کے یہ مینار الگ الگ جھکے ہوئے کیوں تعمیر کیے گئے تھے اور آخر صدیوں تک وہ بغیر

گرے یوں کیسے صحیح سالم کھڑے رہے؟

ریگستان چوک سے ذرا دور' اس مسجد کی خستہ عمارت ہے جو بی بی خانم مسجد کہلاتی ہے۔

اس مسجد کے بارے میں مختلف روایات ہیں ــ ایک روایت یہ ہے کہ یہ مسجد خود امیر تیمور نے تعمیر کرائی تھی ــ لیکن دوسری روایت یہ ہے کہ یہ مسجد امیر تیمور کی نہایت خوبصورت چینی نژاد بیگم ــ بی بی خانم نے اس وقت تعمیر کرائی تھی جب امیر تیمور' ہندوستان فتح کرنے گئے ہوئے تھے۔ یہ مسجد امیر تیمور کے لیے بی بی خانم کا تحفہ تھی۔ پھر اس مسجد کے معمار اور بی بی خانم کے عشق کی داستان بھی مشہور ہے جس کے بعد کہا جاتا ہے کہ امیر تیمور نے اپنی سلطنت میں تمام خواتین کو پردے کا حکم دیا تھا ــ گو اب اس تحفہ کا بیشتر حصہ ملبے کا ڈھیر بن چکا ہے لیکن آزاد ازبکستان کی حکومت نے اس مسجد کی بحالی اور مرمت کا کام بڑے پیمانہ پر شروع کیا ہے۔

قریب ہی ایک نیلا مقبرہ ایک منفرد آن بان کے ساتھ ایستادہ ہے۔ اس کے ٹائلوں پر بے حد نفیس نیلے نقش و نگار بنے ہوئے ہیں اور حاضری دینے والے اتنے احترام اور عقیدت کے ساتھ اس مقبرہ میں داخل ہوتے ہیں کہ اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

ایک بلند مینار سے ملحق ایک محرابی دروازہ ہے۔ وسیع احاطہ میں چار محرابوں پر نیلا گنبد ہے جس کے نیچے قبر ہے۔

یہ عالم اسلام کے ممتاز فقیہہ اور محدث' محمد بن اسمٰعیل ابو عبداللہ الجعفی کی قبر ہے جو امام بخاری کے نام سے مشہور ہیں۔ امام بخاری نے گیارہ سال کی عمر سے حدیث کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی تھی اور سولہ سال کی عمر میں تعلیم کے لیے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ گئے تھے۔ اس کے بعد مصر میں سولہ سال تک تعلیم حاصل کی اور ایشیا کی سیاحت کے بعد وطن واپسی پر احادیث نبویؐ ــ الجامع الصحیح میں جمع کیں اور ساٹھ سال کی عمر میں سمرقند میں اس دارفانی سے چل بسے۔

سمرقند کے ایک سرے پر گور امیر ہے۔ جہاں امیر تیمور اور ان کے خاندان کے افراد دفن ہیں۔

فیروزی رنگ کے گنبد والا یہ مقبرہ' امیر تیمور نے اپنے پوتے' محمد سلطان کے لیے تعمیر کرایا تھا اور چند سال بعد ۱۴۰۵ء میں اسی میں اس کی تدفین ہوئی۔

امیر تیمور کے بغل میں ان کے روحانی اتالیق میر سعید بیر کے دفن ہیں۔ امیر تیمور کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سے دو تیمور کے آبائی شہر۔۔ شہر سبز میں دفن ہیں اور دو شاہ رخ اور میران شاہ' ان کے پہلو میں گور امیر میں دفن ہیں۔۔ ان کے پوتے الغ بیگ کی بھی قبر اسی گنبد کے نیچے ہے۔

الغ بیگ کے سائنسی نظریات نے اس زمانے میں زبردست تہلکہ مچا دیا تھا۔۔۔ ان نظریات کی مخالفت میں خود ان کا بیٹا عبداللطیف پیش پیش تھا اور اسی نے انھیں موت کی سزا دی اور ان کا سر تن سے جدا کرا دیا۔

عبداللطیف بھی اس گنبد کے نیچے دفن ہے۔

گور امیر کے اس چھوٹے سے گنبد کے نیچے' وسیع و عریض سلطنت کے دبدبے والے حکمران امیر تیمور اور ان کی تین نسلیں چند مربع گز جگہ میں دفن ہیں۔ دنیا کے ٹھاٹ باٹ کی بے ثباتی کا احساس یہاں اس شدت سے ہوتا ہے کہ دل دہل جاتا ہے۔

امیر تیمور کی قبر ان سب قبروں میں نمایاں ہے۔ ان کی قبر گہرے سبز رنگ کے پتھر کی بنی ہوئی ہے جو وسط ایشیا میں نایاب ہے حتیٰ کہ چین میں بھی جہاں JADE کی بہتات ہے اس مخصوص رنگ کا پتھر کہیں بھی نہیں ملتا۔ یہ بات واقعی پراسرار ہے کہ یہ پتھر آیا کہاں سے؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ امیر تیمور کو ازبکستان کے عوام نہ صرف ایک عظیم حکمران تسلیم کرتے ہیں بلکہ بہت سے انھیں ولی بھی مانتے ہیں۔۔

گزشتہ ستر برس کے دوران کمونسٹوں نے وسط ایشیا کی تاریخ کی کتابوں سے امیر تیمور کا نام بالکل مٹا دیا تھا لیکن ستم ظریفی یہ کہ سیاحوں کی کشش کے لیے سمرقند میں تیموری دور کی عالی شان عمارتوں کو محفوظ رکھا گیا۔۔۔ ویسے یہاں تمام دینی مدرسوں کو بند کر دیا گیا تھا اور مساجد میں نمازوں کی ادائیگی ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ اب

مدرسے دوبارہ آباد ہو رہے ہیں اور مساجد سے اذانیں گونج رہی ہیں۔۔۔ ازبکستان کی آزادی کے بعد ایسا لگتا ہے کہ تاریخ انتقامی جذبہ کے ساتھ لوٹ آئی ہے۔

اس وقت جب کہ ازبکستان کے عوام اپنا نیا قومی تشخص تلاش کر رہے ہیں اور اپنی تاریخ، اپنی ثقافت اور روایات کی تجدید کر رہے ہیں پھر ایک بار امیر تیمور کو قومی ہیرو کے طور پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔

وہ شاہراہ جو ۱۹۲۰ء میں مسلم مزاحمت کچلنے والے روسی بالشویک کمانڈر فرونزے کے نام سے موسوم تھی اس کا نام اب "تیمورلنگ بولے وارڈ" رکھا گیا ہے اور کمونسٹ ایونیو کا نام بدل کر تیمورلنگ کی ملکہ بی بی خانم کے نام پر رکھا گیا ہے۔

مشہور تھا کہ امیر تیمور کی قبر میں بے انتہا سونا اور ہیرے جواہرات دفن ہیں۔ چنانچہ جب نادر شاہ نے اٹھارہویں صدی میں سمرقند فتح کیا تو وہ شہر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے تیمور کی قبر کی طرف لپکا۔ اس قبر کو کھدوایا لیکن کچھ نہ ملا۔ قبر جو دو ٹکڑے ہو گئی تھی کو دوبارہ جوڑ دی گئی لیکن بال برابر نشان قبر کے پتھر میں رہ گیا ہے۔

۱۹۴۱ء میں آثار قدیمہ کے ماہرین نے امیر تیمور اور ان کے اہل خانہ کی قبریں کھودی تھیں۔ عین اکیاون سال پہلے روسی حکام نے آثار قدیمہ کے ایک ماہر پروفیسر گراسیموف کو امیر تیمور اور ان کے اہل خانہ کے باقیات کا معائنہ کرنے کی اجازت دی تھی۔ پروفیسر گراسیموف نے اس معائنہ کے بعد امیر تیمور کی ایک شبیہ تیار کی جس میں ان کے بالوں کا رنگ سرخ دکھایا گیا تھا اور قد۔۔۔ ۵ فٹ ۸ انچ۔۔ انہوں نے اس کی بھی تصدیق کی کہ تیمور کے ایک پیر میں تیر کے زخم کی وجہ سے لنگ تھا۔ پروفیسر گراسیموف نے امیر تیمور کے پوتے الغ بیگ کے بارے میں بھی یہ تصدیق کی کہ ان کا سر تن سے جدا تھا۔

امیر تیمور کو غالباً اس کا خدشہ تھا کہ لوگ ہیرے جواہرات کی تلاش میں یا محض تجسس میں ان کی قبر کھودنے کی کوشش کریں گے۔ اس بنا پر انہوں نے خبردار کیا تھا کہ "جس نے میری ہڈیوں کو کھکھورا وہ ایسی آفت کا شکار ہو گا کہ اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔"

پروفیسر گراسیموف نے ۲۱ جون ۱۹۴۱ء کو امیر تیمور کی ہڈیوں کو ہاتھ لگایا تھا اور ان کے ہاتھ میں ان کی کھوپڑی تھی--- اسی روز نازی جرمنی نے سوویت یونین پر بھرپور حملہ کیا--- اور سوویت یونین کو ایسی طویل خونریز آفت کا سامنا کرنا پڑا کہ اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی---

ممکن ہے کہ یہ محض اتفاق ہو--- بہرحال جب میں نے امیر تیمور کی قبر پر فاتحہ ختم کی تو ان کی قبر پر کھدے ہوئے ان کے قول پر میری نظر پڑی۔
لکھا تھا---

"اس سے پہلے کہ دنیا تجھ سے منہ موڑ لے تو خود دنیا چھوڑ کر چلا جا---"

اب بھی جب بھی امیر تیمور کا ذکر آتا ہے ان کی قبر پر تحریر یہ قول میرے ذہن میں گونجنے لگتا ہے۔

باب ۱۳

ایک سڑک پر آباد شہر

سوویت یونین کا شیرازہ منتشر ہونے کے بعد اب بھی دو سوویت اداروں کا نفوذ برقرار ہے۔ ان میں ایک سابق سوویت فوج ہے جو سابق سوویت جمہوریاؤں میں آزادی کے بعد اب بھی تعینات ہے۔ دوسرا سیاحت کا ادارہ "ان ٹورسٹ" ہے۔ ان ٹورسٹ کے مسافر کی حیثیت سے سفر میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہوائی اڈہ پر آؤ بھگت' وی آئی پی یعنی بہت ہی اہم شخصیت کی حیثیت سے کی جاتی ہے اور سابق سوویت جمہوریاؤں کے ہر ہوائی اڈے پر ان ٹورسٹ کے مسافروں کے لیے الگ نہایت صاف ستھرے اور آرام دہ لاؤنج ہیں۔ یوں ان ٹورسٹ کے مسافر ہوائی اڈے کی بھیڑ بھاڑ اور امیگریشن اور کسٹمز کی چھیڑ چھاڑ سے بچ جاتے ہیں لیکن سہولت اور خاطر تواضع کی حدیں بس یہیں ختم ہو جاتی ہیں۔

تاشقند سے تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبہ کی پرواز کے لیے جب میں روسی ایرفلوٹ کے طیارے میں داخل ہوا تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں برصغیر کی کسی پسنجر ٹرین کے تیسرے درجے کے ڈبے میں جا پہنچا ہوں۔ مسافر انواع و اقسام اور حجم کے سامان سے لدے پھندے ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔ نشستوں کے اوپر لگے ریک' سامان سے اٹے پڑے تھے اور مسافروں نے اپنی نشستوں کے نیچے ایک کے اوپر ایک تھیلے ایسے ٹھونسے ہوئے تھے کہ یہ نشستوں کی سطح تک آ گئے تھے اور بعض مسافر تو ان پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔

میری نشست کھڑکی کے برابر تھی۔ لیکن وہاں تک پہنچنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ آئیل کی طرف نشست پر ایک نہایت تندرست خاتون اپنے ہی ایسے فربہ بچے کو جکڑے بیٹھی تھیں۔ اس بچے کو برابر کی نشست پر بیٹھے ہوئے روسی فوجی افسر کی وردی بڑی اچھی لگ رہی تھی اور وہ بار بار اس کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ روسی افسر نے اپنے چہرے پر گھمبیرتا کی ڈھال لگا دی تھی جس سے خاتون کی نظریں ٹکرا ٹکرا کر لوٹ رہی تھیں۔

میں ہی جانتا ہوں کہ کس مشکل سے میں اپنی نشست تک پہنچا۔ لیکن نشست پر بیٹھنا محال ہو گیا کیونکہ سامنے والی نشست پر ایک تومند قزاق فر کی بڑی سی ٹوپی لگائے نشست کو پیچھے جھکائے سو رہا تھا۔۔ اسے جگا کر میں اپنی نشست پر بیٹھا تو ان کا سر بمعہ فر میری گود میں آ دھرا اور یوں لگا کہ میں بڑی سی بلی لیے بیٹھا ہوں۔ اس وقت طیارے میں فارسی گانا۔۔ "خوش آمدی خوش آمدی" گونج رہا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ عباس خاں نے تاشقند میں کہا تھا کہ سابق سوویت یونین میں فضائی سفر بسوں کے سفر کی طرح عام ہے۔ ایک تو فاصلے بہت طویل ہیں دوسرے اب بھی فضائی کرائے نسبتاً سستے ہیں۔ تاشقند سے دوشنبہ جانے والی پرواز میں اس قدر بھیڑ کی تیسری وجہ بھی تھی اور وہ یہ کہ زمینی راستہ نہایت دشوار گذار ہے۔ شمالی تاجکستان تک پہنچنا تو تاشقند سے آسان ہے لیکن دوشنبہ کے راستے میں بلند پہاڑوں کے سلسلے ہیں۔

اور جب میں نے پرواز کے دوران طیارہ کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو میں دم بخود رہ گیا۔ طیارہ دو برف پوش پہاڑوں کے بیچ میں ایک نہایت تنگ گلی میں سے گزر رہا تھا۔ اور سامنے اچانک پہاڑوں کا ایک سلسلہ نظر آیا۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں طیارہ ان پہاڑوں سے نہ ٹکرا جائے لیکن طیارہ آناً فاناً اوپر اٹھا اور ان پہاڑوں پر ایسے پرواز کر گیا کہ جیسے انہیں پھلانگ گیا ہو۔ نیچے برف سے ڈھکی ہوئی وادی تھی جس کے دوسرے سرے پر حصار کے برف پوش پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ وادی میں جا بجا بستیوں کے مکانات کی چمنیوں سے اٹھتا ہوا دھواں طیارے کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن

طیارہ اس دھویں کو جل دیتا ہوا وادی کے ایک کنارے پر واقع ہوائی اڈے پر جا اترا۔ جس پر کوئی دوسرا مسافر طیارہ تو نظر نہیں آیا البتہ چھوٹے چھوٹے بوسیدہ سے فوجی طیارے' قطار میں کھڑے تھے۔

یہ تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبہ کا ہوائی اڈا تھا۔

یہاں نہ کسی نے پاسپورٹ دیکھا نہ ویزا چیک کیا اور نہ کسٹمز کی بھول بھلیوں سے گزرنا پڑا۔ مسافروں کو ایک طرف تار لگے پھاٹک کی سمت لے جا کر یوں چھوڑ دیا گیا کہ جیسے وہ رہا کر دیے گئے ہوں اور اپنے آپ جہاں چاہیں اپنی راہ لیں۔

پھاٹک کی دوسری جانب سڑک پر بسیں اور ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ کئی ٹیکسی ڈرائیور میری طرف لپکے لیکن ان میں سے ایک پہلوان نما ڈرائیور نے بڑی تیزی سے میرا سامان بغیر پوچھے مجھے اسی طرح اٹھا لیا جس طرح ہندوستان اور پاکستان میں ریلوے پلیٹ فارم پر قلی سامان اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں کہ مسافر خود بخود ان کے پنجے میں آ جائے گا۔

میں بے بس تھا۔ میں نے صرف اتنا پوچھا کہ ہوٹل تک کتنا کرایہ ہو گا؟ اس نے مسکراتے ہوئے روسی میں کہا کہ آپ فکر نہ کریں' آپ ہمارے مہمان ہیں۔ میں نے جب اس کے جواب میں کہا۔ صد تشکر تو ٹیکسی ڈرائیور چونکا۔ اس نے پیچھے مڑ کر مجھے تجسس کی نگاہ سے دیکھا اور پوچھا کہ آپ کو تاجک آتی ہے؟ کہاں سیکھی یہ تاجک؟ میں نے جواب دیا کہ یہ تو فارسی ہے۔

اس نے اصرار کیا کہ نہیں یہ تاجک ہے۔

تب مجھے یاد آیا کہ پروان خان جمشیدوف نے' جن کا تعلق تاجکستان سے ہے اور آج کل بی بی سی کے شعبہ فارسی سے منسلک ہیں' لندن میں بتایا تھا کہ کمونسٹ دور میں یہاں کی فارسی زبان کو تاجک قرار دیا گیا تھا اور یہ علاقہ' کمونسٹ انقلاب کے بہت بعد میں تاجکستان کے نقشہ پر ابھرا تھا۔

پروان خان جمشیدوف نے بتایا تھا کہ کمونسٹ انقلاب سے پہلے تاجکستان کا شمالی علاقہ ۱۸۶۸ء سے زار روس کے تسلط میں تھا اور جنوبی علاقہ' امیر بخارا کی ریاست کا

حصہ تھا۔ انقلاب کے بعد کئی سال تک یہ علاقہ ازبکستان کی سوویت جمہوریہ کا حصہ رہا۔ پھر ۱۹۲۹ء میں اسٹالن نے تاجکستان کی سوویت جمہوریہ تشکیل کی اور اس کی اس طور سے سرحدیں کھینچیں کہ سمرقند اور بخارا سمیت' آدھا تاجک علاقہ ازبکستان میں شامل کر دیا گیا اور باقی ماندہ نصف خطے پر تاجکستان کے نام سے نئی جمہوریہ قائم کی گئی۔ اب بھی سمرقند اور بخارا میں فارسی بولنے والے تاجکوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ اور پورے ازبکستان میں ۸۰ لاکھ کے لگ بھگ تاجک ہیں۔ ادھر تاجکستان میں دس لاکھ کے قریب ازبک آباد ہیں' خاص طور پر شمال کے پانچ اضلاع میں---- مقصد اس زمانے میں اسٹالن کا یہ تھا کہ وسط ایشیا کے اس پورے علاقے کو جو زار روس کے زمانے میں روسی ترکستان کہلاتا تھا' لسانی اور نسلی بنیاد پر اس انداز سے چھوٹی چھوٹی جمہوریاؤں میں بانٹ دیا جائے کہ یہ سب کمزور رہیں اور اس کمزوری کو دوام بخشنے کے لیے ان میں آڑے ترچھے نسلی پیوند ٹانک دیے۔

تاجکستان کی جمہوریہ کا رقبہ صرف ایک لاکھ ۴۳ ہزار مربع کلو میٹر ہے لیکن اس کی اس بنا پر بے حد اہمیت ہے کہ مغرب میں اس کے ازبکستان ہے' شمال میں کرغیزیہ ہے' مشرق میں چین کی سرحدیں اس سے ملتی ہیں اور جنوب میں افغانستان ہے جہاں واخان کی باریک سی پٹی' تاجکستان کو پاکستان سے جدا کرتی ہے۔

آبادی تاجکستان کی ۴۳ لاکھ کے لگ بھگ ہے جس میں تاجکوں کی تعداد ۲۱ لاکھ سے ذرا زیادہ ہے۔ صرف ۵۶ فی صد' باقی ازبک' روسی' تاتار' یہودی' ترکمان' جرمن' کرغیز اور یوکرین باشندے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ تاجکوں کی اکثریت' تاجکستان سے باہر آباد ہے۔ ان میں سے چالیس لاکھ افغانستان میں ہیں اور خاصی تعداد ایران اور سن جیانگ میں بسی ہوئی ہے۔

تاجک' وسط ایشیا کے فارسی بولنے والے لوگ ہیں جو اس علاقے کی قدیم ترین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک ہزار سال قبل مسیح میں فارسی بولنے والے قبائل' پورے ایشیائی علاقے سے وسط ایشیا کے علاقے میں آئے تھے اور تانبے کے عہد میں

یہاں کے قبائل کو اپنے میں ایسا جذب کر لیا کہ اس پورے علاقے پر فارسی بولنے والے حاوی ہو گئے۔

آٹھویں صدی میں جب فاتح عرب' وسط ایشیا میں داخل ہوئے تو اس وقت تاجکستان کا علاقہ تین حصوں میں منقسم تھا' شمال میں سغدیہ کا یہ علاقہ تھا' شمال مشرق میں فرغانہ اور جنوب میں تو شاری علاقہ تھا۔ اس زمانہ میں اس پورے علاقے پر زرتشتیوں اور بودھوں کا اثر تھا۔ نویں اور دسویں صدی میں' اس علاقہ میں سامانی سلطنت نے تاجکوں کے تشخص کو فروغ دیا اور فارسی زبان اور اس کی ثقافت کو ایک نئی ضیاء بخشی۔ اس دور میں رودکی اور فردوسی ایسے شاعر پیدا کیے۔

تیرھویں صدی میں وسط ایشیا' چنگیز خان کی سربراہی میں منگولوں اور تاتاریوں کی فوج کے تباہ کن حملوں کا نشانہ بنا۔ اس وقت تک اس علاقے میں ترک نسل نے اپنے قدم جما لیے تھے۔

ترک نسل کے افراد اصل میں کہاں سے آئے؟ یہ سوال جب میں نے تاشقند یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر' آزاد شاتوف سے کیا تھا تو ان کا کہنا تھا کہ اصل میں ترک لوگ جو یہاں رہتے تھے ان کی شروعات میرے خیال میں یہاں سے نہیں بلکہ سائبیریا سے ہوئی تھی جہاں انہوں نے اپنا پہلی بار رسم الخط بھی پیش کیا تھا اور وہ لوگ کوچ کر کے یہاں وسط ایشیا آئے تھے۔ مگر بعض مورخوں کا یہ خیال ہے کہ ان کے آنے سے پہلے یہاں کچھ ترکی قبائل بھی رہتے تھے اور جہاں تک چنگیز کی بات ہے تو چنگیز تیرھویں صدی میں آئے تھے تب تک تو یہاں ترکی سلطنتوں اور ترکی خاندانوں کا کافی چرچا ہو چکا تھا اور ثقافت بھی بن چکی تھی اور کافی پائداری بھی ہو چکی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ چنگیز خان سے جو تعلق ہے وہ ایک پرچہ جیسی چیز ہے۔ ہماری تاریخ کا ایک پرچہ ہے۔ ایک ٹکڑا ہے۔

چنگیز کی تباہی و بربادی کے بعد وسط ایشیا کے اس پورے علاقے کو امیر تیمور نے نئی جان اور نئی آن بخشی اور برصغیر سے ان پرانے رشتوں اور روابط کی تجدید کی جو صدیوں پہلے بدھ مت کے ذریعہ قائم تھے اور پھر' تیمور کے بعد بابر نے برصغیر کو اپنا کر

ان روابط کو اور مضبوط و مستحکم بنایا لیکن اس دوران وسط ایشیا کا علاقہ کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا اور جب زار روس نے برصغیر میں برطانوی راج کے استحکام کی دیکھا دیکھی' وسط ایشیا پر تسلط کا ارادہ کیا تو اسے کوئی زیادہ مشکل پیش نہیں آئی اور ستر سال پہلے جب اشتراکی انقلاب برپا ہوا تو اس نے زار روس کے اس علاقے پر یوں تسلط جمایا کہ جیسے وہ زار روس کا جانشین ہے۔

میں اپنے ذہن میں تاجکستان کی تاریخ کے صفحات الٹ رہا تھا کہ ٹیکسی جو ابھی تک ہوائی اڈے سے سیدھی سڑک پر رواں تھی ایک بڑے سے چوک پر جھٹکے کے ساتھ رک گئی --- یہاں وہ سڑک ختم ہو گئی جو ہوائی اڈہ سے شروع ہوتی تھی نام اس کا فارسی کے مشہور شاعر آئینی کے نام پر ہے۔

اس کے بعد ٹیکسی سیدھے ہاتھ کی طرف ایک نہایت خوبصورت شاہراہ پر مڑ گئی جس کے دونوں طرف بلند درخت کھڑے تھے اور ان درختوں کی اوٹ سے جدید عمارتیں جھانک رہی تھیں جن پر مشرقی طرز تعمیر کا عنصر نمایاں تھا --- ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ یہ شاہراہ خیابان رودکی ہے جو آزادی سے پہلے خیابان لینن کہلاتی تھی۔ ویسے خود دارالحکومت دوشنبہ کا نام بھی دو بار بدلا گیا ہے۔ انقلاب سے پہلے یہ تاریخی وادی حصار میں دریائے دوشنبہ کے کنارے ایک چھوٹا سا قصبہ تھا لیکن چونکہ انقلاب کے دوران اشتراکیوں کا تاجکستان میں یہ پہلا مرکز تھا لہٰذا انقلاب کی کامیابی کے بعد اس کا نام بدل کر اسٹالن آباد رکھا گیا تھا لیکن جب اسٹالن کی موت کے بعد خرشیوف کے دور میں اسٹالن کی ملامت اور مذمت کی مہم شروع ہوئی تو اس شہر کا نام بدل کر دوبارہ دوشنبہ رکھا گیا۔

نام کے ساتھ ساتھ اس شہر کی تقدیر بھی بدلی ہے۔ وہ لوگ بھی جنہیں کمونزم سے کوئی الفت نہیں وہ بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ شہر کمونسٹ دور کی ترقی کا آئینہ دار ہے۔ انقلاب سے پہلے دوشنبہ' بخارا کی ریاست کا ایک دور دراز چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں ہر جمعہ کو منڈی لگتی تھی' اس کے قریب جذامیوں کی بستی "سکلاک" تھی۔ دور دراز تک علاقہ بنجر اور پتھریلا تھا' اس شہر کے لیے لکڑی اور

دوسرا عمارتی سامان ڈھائی سو کلومیٹر دور سے لایا گیا۔

پھر میرے خیال میں یہ دنیا کا واحد دارالحکومت ہے جہاں پارلیمنٹ' ایوان صدر سرکاری دفاتر' سیاسی جماعتوں کے مراکز' یونیورسٹی' تھیٹر اوپیرا میوزیم' سینما گھر' مرکزی ڈاک خانہ' پارک' چائے خانے اور ہوٹل' سب ایک پانچ میل لمبی سڑک خیابان رودکی پر واقع ہیں۔۔۔ شمال میں دانش' آرٹ اور فنون لطیفہ کے مراکز ہیں' وسط میں پارلیمنٹ اور سرکاری دفاتر ہیں اور جنوب میں ریلوے اور کارخانے ہیں۔

خیابان رودکی کے دونوں سمت' نپے تلے فاصلے سے سڑکیں نکلتی ہیں جن پر رہائشی فلیٹس کی تین منزلہ عمارتیں ہیں۔ ان کے بیچ میں جگہ جگہ چھوٹے باغ ہیں۔

خیابان رودکی کے مشہور چائے خانے راحت میں دو شنبہ یونیورسٹی کے شعبہ شرق شناسی میں اردو کے ایک استاد' عثمانوف اکبر سے ملاقات طے تھی۔ میں جب اس چائے خانہ میں داخل ہوا تو اس وقت حافظ شیرازی کی مشہور غزل' "اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا" ڈسکو کے جدید ترین ساز و آواز میں گونج رہی تھی۔

میں خیابان رودکی پر چہل پہل دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وسط ایشیا کے اس علاقہ کی فضا کس قدر انقلاب آفریں ہے۔

حافظ نے جب چھ سو سال پہلے دریائے رکن آباد کے کنارے بید کی چھاؤں میں بیٹھ کر یہ غزل لکھی تھی تو اس وقت انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک زمانہ وہ آئے گا جب دریائے دو شنبہ کے کنارے اس شہر میں ان کی اس غزل کو جدید لبادہ پہنا دیا جائے گا۔

از خواب گراں خیز

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز
کاشانۂ ما رفت بہ تاراجِ غماں خیز
از نالۂ مرغِ چمن از بانگِ اذاں خیز
از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز

دریائے تو دریاست کہ آسودہ چو صحرا است
دریائے تو دریاست کہ افزوں نہ شد و کاست
بیگانۂ آشوب و نہنگ است چہ دریاست
از سینۂ چاکش صفتِ موجِ رواں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی
دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی
صہبائے یقیں درکش و از دیرِ گماں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز

تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبہ کے چوک آزادی میں پارلیمنٹ کی عمارت کے سامنے جب میں نے جوش و عقیدت سے سرشار مظاہرین کو علامہ اقبال کا یہ ترانہ نہایت والہانہ انداز سے پڑھتے دیکھا تو مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میں لاہور سے سیکڑوں میل دور' راوی' چناب اور جہلم کے سرسبز کناروں کے پار' درہ خیبر کی سنگلاخ چٹانوں سے پرے اور پامیر کے آسمان بوس پہاڑوں کے مغرب میں دریائے دوشنبہ کے کنارے اس شہر میں اقبال کی صدا سن رہا ہوں۔

اقبال کی یہ نظم' تاجکستان کی ایک بڑی سیاسی جماعت "رستاخیز" نے اپنے ترانے کے طور پر یوں اپنائی ہے کہ جیسے یہ ان کے اپنے قومی شاعر کی نظم ہو۔۔ مجھے ایسا لگا کہ راوی کے کنارے' دریائے دوشنبہ سے آن ملے ہوں۔۔۔ برسوں سے بچھڑی ہوئی دو بہنوں کی طرح۔۔

دو سال پہلے رستاخیز پارٹی نے اس ترانہ کی گونج میں تاجکستان میں سوویت راج اور کمونسٹ حکومت کو للکارا تھا۔ پچاس لاکھ نفوس کی اس چھوٹی سی جمہوریہ میں یہ عمل ایک نئے انقلاب سے کم نہ تھا۔ جس میں اسلامی جماعت نہضت اسلامی بھی شامل تھی۔ ۱۹۹۰ء سے قبل یہ دونوں جماعتیں خفیہ طور پر اپنے اپنے انداز سے سرگرم عمل تھیں اور بلاشبہ' اس جمہوریہ کی آزادی کی نقیب ثابت ہوئیں۔

آزادی تو سوویت یونین کے بکھرنے کے ساتھ آسانی سے مل گئی لیکن تاجکستان کی پرانی کمونسٹ قیادت جس نے اگست ۹۱ء کی ناکام بغاوت ماسکو کے بعد اپنا بھیس بدل لیا تھا ابھی تک برقرار ہے۔ ۶۱ سالہ صدر رحمان نبی اسیف ۸۲ء سے ۸۵ء تک تاجکستان کے کمونسٹ حکمران رہ چکے تھے' نومبر میں آزادی کے بعد سے صدارتی انتخاب میں کامیاب رہے تھے۔ ان کے مدمقابل ۴۷ سالہ فلم ہدایت کار دولت خدا نذروف تھے جنہیں رستاخیز پارٹی اور نہضت اسلامی' دونوں جماعتوں کی حمایت حاصل تھی۔۔۔ پھر کیا وجہ ہے کہ خدا نذروف' سابق کمونسٹ رہنما' رحمان نبی اسیف کے مقابلہ میں ناکام رہے؟ یہ بات جب میں نے دوشنبہ میں رستاخیز پارٹی کے سربراہ طاہر عبدالجبار سے پوچھی تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ

یہ ہماری ناکامی ہے۔ کیونکہ ۳۵ فی صد سے زیادہ عوام نے جمہوریت کے عہد کی حمایت کی ہے حالانکہ آزادی کے حصول کو بہت کم عرصہ گزرا ہے اور یہ بات خود ایک کامیابی ہے۔ البتہ ہمارے امیدوار صدر نہیں بن سکے۔ وجہ میرے خیال میں اس کی یہ ہے کہ انتخابی مہم کے لیے صرف چالیس روز ملے تھے اور اس دوران عوام سے پوری طرح سے رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔

پھر ابھی عوام میں سیاسی شعور بلند نہیں ہوا اور ماضی میں تاجکستان میں جمہوری روایات کو فروغ کا موقع نہیں ملا۔۔۔ لہٰذا ابھی بیشتر عوام بیدار نہیں ہوئے ہیں۔ پھر موجودہ صدر نبی اسیف کمونسٹ دور میں صدر اعظم تھے اور کمونسٹ پارٹی کے اول سکریٹری تھے اور انہیں پارٹی کے پرانے ڈھانچے کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔"

بہرحال تاجکستان' وسط ایشیا کے نقشہ پر جس آڑے ترچھے انداز سے نظر آتا ہے اس کی سیاست بھی اسی طرح ٹیڑھی اور نہایت پیچیدہ ہے۔۔۔ ایک طرف صنعتی طور پر ترقی یافتہ شمال اور دوسری طرف پسماندہ جنوب کے درمیان کشمکش ہے۔ کمونسٹ دور میں سیاست کے صحن میں شمال' غالب رہا ہے۔۔۔ پھر ملک ابھی تک قبائل میں بٹا ہوا ہے اور پچھلے ستر سال کے کمونسٹ نظریاتی دور میں بھی سیاست سے قبائلی اثرات ختم نہیں ہوئے ہیں۔ رحمان نبی اسیف بھی شمالی علاقہ کے لینن آباد شہر کے قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

تاجکستان کی سیاست کے اس گورکھ دھندے کو اس بات نے اور مشکل بنا دیا ہے کہ ملک کا ۹۳ فی صد علاقہ پہاڑوں پر مشتمل ہے جو اپنے بطن میں معدنی دولت سمیٹے ہوئے ہیں لیکن اس سے فیض یاب ہونے کے لیے وسائل اور سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اس وقت یہ پہاڑ محض ظاہری حسن کا سامان ہیں یوں یہ ملک پر حسین بوجھ بنے ہوئے ہیں۔

تاجکستان کی پارلیمنٹ' شوریٰ اعلیٰ کے انتخابات آزادی سے ذرا پہلے سن نوای میں ہوئے تھے جس میں ۹۰ فی صد اراکین سابق کمونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ حزب مخالف کے صرف گنے چنے اراکین تھے جن میں رستاخیز کے سربراہ طاہر

عبدالجبار بھی تھے۔۔۔ نہضت اسلامی کا اس پارلیمنٹ میں کوئی رکن نہیں تھا۔۔ کیونکہ اس وقت جماعت کو اس بنا پر قانونی حیثیت حاصل نہیں تھی کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے۔

لیکن فروری ۱۹۹۰ء میں جب آرمینائی باشندوں کو تاجکستان میں پناہ دینے پر حکومت کے خلاف خونریز ہنگامے ہوئے تو اس کے بعد حکومت کو گھٹنے ٹیک دینے پڑے اور نہضت اسلامی کو کھلے عام تنظیم کی اجازت مل گئی۔ نہضت اسلامی کے سربراہ محمد شریف ہمت زادہ ہیں۔ پرچم اس جماعت کا سبز' سفید اور سرخ پٹیوں والا ہے جس کے کونے میں چاند تارا بنا ہے اور بیچ میں کلمہ طیبہ تحریر ہے۔

نہضت اسلامی کے سربراہ محمد شریف ہمت زادہ کا کہنا ہے کہ ابھی تاجکستان کی آزادی محض کاغذ پر ہے۔ اسے مکمل آزادی نہیں کہا جا سکتا۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تاجکستان مکمل طور پر آزاد نہیں کیونکہ سوویت یونین کے سقوط کے بعد تاجکستان' نام نہاد آزاد مملکتوں کے دولت مشترکہ میں شامل ہوا ہے اور اس میں شمولیت کے ذریعہ تاجکستان نے اپنی سرزمین پر سابق روسی فوج کو برقرار رکھنے کی اجازت دی ہے۔ یہ بات کسی طرح بھی آزادی سے مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ غیر منطقی بات ہے۔"

آزادی کے بعد تاجکستان کی پارلیمنٹ' عوام کی رائے عامہ کا غیر نمایندہ ادارہ بن کر رہ گئی تھی اور رحمان نبی اسیف کی بے جماعتی قیادت نے عوام میں جو بے چینی پیدا کی اس کا اظہار' جون ۹۲ء کے خوں ریز احتجاج کی صورت میں ہوا۔ آخر کار نبی اسیف کو قومی مصالحت کی حکومت کی تشکیل پر راضی ہونا پڑا جس میں نہضت اسلامی کے نائب سربراہ دولت عثمان' نائب صدر مقرر ہوئے تھے۔

حکومت میں شمولیت سے پہلے دو شنبہ میں میری دولت عثمان سے ملاقات ہوئی تھی اور جب میں نے ان سے پوچھا کہ ان کی جماعت کس نوع کا آئین چاہتی ہے اور کیا نہضت' اسلامی شریعت کے نفاذ پر اصرار نہیں کرے گی تو اس کے جواب میں دولت عثمان نے کہا تھا کہ "اس ملک میں ۹۰ فی صد مسلمان ہیں اور اس لحاظ سے

اسلامی قانون کا نفاذ ہر مسلمان کی آرزو ہے لیکن حزب نہضت اسلامی کا مقصد یہ نہیں کہ جبراً عقائد اسلامی کو عوام پر نافذ کیا جائے البتہ اس کا مقصد یہ ہے کہ عوام میں اسلام کی تعلیم پھیلے اور پارلیمانی طریقہ سے اسلامی قانون نافذ ہو۔"

تاجکستان کے نئے آئین کے بارے میں رستاخیز پارٹی کا موقف واضح ہے۔ اس جماعت کے سربراہ طاہر عبدالجبار سے جب میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وہ سیکولر اور جمہوری آئین کے خواہاں ہیں۔۔۔ "ہم یہ چاہتے ہیں کہ تاجکستان میں عوام کا نظام ہو۔ ہم نہ تو آمریت چاہتے ہیں جیسے کہ پہلے تھی' نہ ہم مذہبی اور ملائی نظام چاہتے ہیں۔ ہم ایسا عدل نظام چاہتے ہیں جس میں ہر شخص کو مناسب مقام ملے۔ ہم چاہتے ہیں کہ نیا آئین عوام کی آرزوؤں اور اسلامی اور جمہوری تمناؤں کا عکاس ہو۔"

رحمان نبی اسیف کے قریبی ساتھی اور ان کی حکومت میں نائب وزیر خارجہ ارکن رحمت اللہ اسیف بھی سیکولر آئین کے حامی تھے۔

آزادی کے بعد تاجکستان میں اسلام سے وابستگی اور قربت اور عقیدت کا جو اظہار ہوا ہے اس کے بارے میں مغرب کے ذرائع ابلاغ میں توجہات سے ارکن رحمت اللہ اسیف متفق نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مغرب میں اخبارات تاجکستان میں اسلامی رجحان کے بارے میں صحیح طور پر واقف نہیں۔۔ ان کا خیال تھا کہ یہ قدرتی بات ہے کہ ستر سال سے زیادہ عرصہ تک عوام کے مذہبی جذبات دبائے گئے تھے اور اب آزادی کے بعد یہ جذبات سامنے آرہے ہیں' پریس ترائیکا سے پہلے تاجکستان میں صرف ۱۷ مساجد تھیں اب مساجد کی تعداد ایک ہزار سے بڑھ چکی ہے۔ رحمت اللہ اسیف نے کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ اس وقت ملک میں بنیاد پرستی کا کوئی خطرہ ہے۔ یہ قوتیں جو اسلام کا نعرہ لگا رہی ہیں انہیں بنیاد پرست قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

دوسری طرف نہضت اسلامی کے سربراہ محمد شریف ہمت زادہ نے اس بات پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ اسلام سے عوام کی دلچسپی کو مغرب میں تشویش کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ تاجکستان' عالمی سیاست میں دوسرا ایران بننے والا

ہے- یہ بالکل غلط ہے- یہ افسوس ناک بات ہے کہ بنیاد پرستی کو انتہا پسندی اور دہشت گردی کا نام دے دیا گیا ہے-

رستاخیز پارٹی کے سربراہ طاہر عبدالجبار نے بھی تاجکستان میں بنیاد پرستی کے خطرہ کو مبالغہ قرار دیا-

جب میں رستاخیز کے دفتر میں طاہر عبدالجبار سے بات کر رہا تھا تو اچانک میری نظر ایک کونے میں رکھے ہوئے جماعت کے پرچم پر پڑی- پرچم کا رنگ ہرا اور سفید تھا جس پر سورج' شعلہ' گندم کی بالی اور زرتشتی "عشتر" ستارہ بنا ہوا تھا-

پرچم پر شعلہ اور عشتر' ستارہ کھلم کھلا تاجکستان کی تہذیب' ثقافت اور انداز فکر پر زرتشتی اثر کی چغلی کھا رہے تھے-- گو زرتشتی مذہب' ترکمانستان کے شہر Merv سے ابھرا تھا لیکن تاجکستان سمیت وسط ایشیا اور ایران میں صدیوں اس مذہب کا اثر رہا ہے جس کے آثار اب بھی زندگی کے مختلف شعبوں میں باقی ہیں-

بہرحال' یہ آثار ایسے ہیں جن سے تاجکستان کو اس طرح کا سنگین بحران درپیش نہیں جیسا کہ تاجکستان میں تعینات' سابق سویت فوج کا ہے جو اب آزاد ملکوں کے دولت مشترکہ کی فوج کہلاتی ہے-

پچھلے دنوں تاجکستان کی پارلیمنٹ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ تاجکستان میں تعینات' دولت مشترکہ کی فوج کے تمام دستے' تاجکستان کی حکومت کے اختیار میں دے دیے جائیں' لیکن دولت مشترکہ کی فوج کے افسروں نے کہا ہے کہ تاجکستان کی سرزمین پر ان کے دستے روسی کنٹرول میں رہیں گے-

جون ۹۲ء میں صدر رحمان نبی اسیف کے خلاف جو خون ریز مظاہرے ہوئے تھے ان میں دولت مشترکہ کی فوج غیر جانبدار رہی تھی--

تاجکستان کی حکومت کا اندازہ ہے کہ دولت مشترکہ کی فوج کو تاجک کمان میں لانے کے لیے آٹھ ارب روبل درکار ہیں- ظاہر ہے کہ تاجکستان اتنی زیادہ رقم کے خرچ کا متحمل نہیں ہو سکتا-

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی کشمکش اور قبائلی معرکہ آرائی اور علاقائی فرق و

امتیاز کی بنا پر تاجکستان اس وقت سنگین خانہ جنگی کے پر آشوب دور سے گزر رہا ہے۔۔۔ یہ خانہ جنگی کیا رخ اختیار کرے گی اور اس ملک کا کیا مستقبل ہو گا۔ اس کا جواب اس وقت کسی کے پاس نہیں۔

زمانہ آتش

تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبہ میں نہضت اسلامی کے دفتر میں جماعت کے سربراہ محمد شریف ہمت زادہ سے ملاقات کے بعد میں جب رخصت ہونے لگا تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے انہوں نے میرے دل میں چھپی ہوئی خواہش بھانپ لی ہو۔ شفقت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے کہا کہ دفتر سے تین گلیاں چھوڑ کر' بائیں ہاتھ کو' دوشنبہ شہر کی سب سے پرانی مسجد ہے۔ آپ یقیناً وہاں جانا چاہیں گے' ویسے بھی ظہر کی نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے۔

میں نے شریف ہمت زادہ کا دل سے شکریہ ادا کیا اور نہضت اسلامی کے دفتر سے نکل آیا۔

یہ بستی' پرانی بستی نظر آتی تھی لیکن ایسا لگتا تھا کہ اس کے پرانے پن کو برقرار رکھتے ہوئے اسے جدید بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ گلیاں پتلی پتلی تھیں لیکن پرانے مکانات کو جو غالباً کسی زمانے میں مٹی کے ہوں گے' اینٹوں اور کھپریلوں کا لبادہ اوڑھا دیا گیا تھا جس پر ان کے مکینوں نے انگور کی بیلیں چڑھا دی تھیں۔

میں نے اس بستی میں مسجد کا پتہ چلانے کے لیے گنبد تلاش کیا لیکن مجھے کہیں گنبد والی کوئی عمارت نظر نہیں آئی ---- البتہ ایک طرف ایک کشادہ سڑک دکھائی دی جس کے کنارے پر ایک لمبی' سفید پتی ہوئی اونچی دیوار کھچی تھی ---- اس دیوار کے پاس ایک ٹیکسی آ کر رکی۔ میں یہ پوچھنے کے لیے کہ مسجد کہاں ہے ٹیکسی کی طرف

لپکا۔ ٹیکسی کا دروازہ کھلا' دیکھا کہ اس میں سے وہی پہلوان نما ڈرائیور اتر رہا ہے جس نے مجھے روشنبہ کے ہوائی اڈے سے ہوٹل پہنچایا تھا۔۔۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس بار اس پر کاروبار کی پرچھائی نہیں تھی۔ خالص عقیدت اور محبت پھوٹی پڑ رہی تھی۔۔۔ اس نے میری طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔۔۔ پوچھنے لگا کہ کیا میں مسجد تلاش کر رہا ہوں؟ میں نے ابھی اثبات میں پوری طرح سر بھی نہ ہلایا تھا کہ وہ میرا ہاتھ پکڑے' اس دیوار میں بنے ہوئے ایک چوبی دروازے کی طرف لے گیا۔

اندر دیکھا تو وسیع و عریض کچا صحن تھا۔ جس کے بیچ میں سرو کا ایک درخت کھڑا تھا اور ایک طرف اونچا مینار تھا اذان دینے کے لیے۔

صحن کے دونوں طرف' لکڑی کے خوبصورت منقش ستونوں والے بڑے بڑے دالان تھے جن پر دالان کی ایک اور منزل تھی۔۔۔ کٹہرے کے ساتھ۔۔۔ سامنے چار بہت اونچے اونچے' چوبی اور خوبصورتی سے ترشے ہوئے ستون تھے جن کے پیچھے مسجد کا اندرونی حصہ تھا۔ ان ستونوں اور دالانوں کے ستونوں سے پتہ چلتا تھا کہ یہ مسجد واقعی کافی پرانی ہے۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ اسے بنے ہوئے ڈیڑھ سو برس سے زیادہ ہونے کو آئے ہیں۔

دالانوں میں قالین بچھے ہوئے تھے اور مارچ کے سورج کی خوشگوار دھوپ میں' قر کی ٹوپیاں پہنے اور نیلی' کالی اور ہری پگڑیاں باندھے معمر افراد' کچھ مغربی سوٹ میں اور کچھ روایتی رنگین دھاریوں والے لمبے روئی بھرے چغوں میں ملبوس اذان کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور' شرف جان نے جب ان سے میرا تعارف کرایا تو یہ سب کے سب اٹھ کر خوشی کے مارے مجھ سے یوں لپٹ گئے کہ جیسے میں ان کا برسوں سے بچھڑا گم شدہ بیٹا ہوں جو اچانک بن بتائے گھر واپس آ گیا ہو۔

اور مجھے بھی ایسا لگا کہ میں نے ان کے دلوں میں پنہاں سوز کہن کے سیل کو تھام لیا ہو۔

نماز کے بعد، بہت سوں کا اصرار تھا کہ میں ان کے گھر چلوں اور چائے پیوں لیکن ٹیکسی ڈرائیور شرف جان نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ چونکہ ان کا گھر خیابان رودکی کے قریب ہے جہاں مجھے نماز کے بعد جانا ہے، اس لیے ان کا حق مجھ پر زیادہ بنتا ہے۔

شرف جان کا فلیٹ، کوچہ پروین کے عقب میں ایک اونچی عمارت میں ہے۔ فلیٹ بڑا نہیں لیکن بڑے سلیقہ سے سجا ہوا تھا۔ فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے اور ان پر فرشی میز، جس پر خشک میوے خوبصورت طشتریوں میں رکھے ہوئے تھے۔ شرف جان کی بیوی گل رخسار نے بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا اور تھوڑی دیر بعد ان کا ۲۰ سالہ بیٹا قناعت اور ۲۵ سالہ بیٹی گل نظر بھی آ گئے۔ قناعت یونیورسٹی میں سائنس کا طالب علم ہے اور گل نظر، وزارت تجارت میں ایک محکمہ کی نائب سربراہ ہے۔ تعلیم ان دونوں کی کنڈر گارٹن ہی سے روسی میں ہوئی ہے لیکن گھر میں یہ تاجک بولتے ہیں۔۔۔۔ تاجک زبان اصل میں فارسی ہے لیکن اسٹالن کے دور میں جب روسی ترکستان کو پانچ جمہوریاؤں میں تقسیم کر دیا گیا تو تاجکستان کے علاقہ میں بولی جانے والی فارسی کو تاجک زبان قرار دیا گیا۔ اس وقت شرف جان کے فلیٹ میں ریڈیو پر فارسی کا نغمہ گونج رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں شرف جان کی بیوی، گل رخسار نے فرشی میز پر چائے کے ساتھ روسی سلاد اور تاجک پلاؤ سجایا۔۔۔۔ پچھلے ستر سال کے دوران، روسی اثر تاجکوں کی زندگی پر کس قدر حاوی ہو چکا ہے۔۔۔ یہ بات گل رخسار کی اس فرشی میز پر سجے خوان سے عیاں تھی۔

میں نے گل رخسار سے پوچھا کہ تاجکستان کی آزادی کے بعد یہاں کی خواتین کیا محسوس کرتی ہیں؟ رنگ برنگا ریشمی حجاب پہنے ہوئے گل رخسار کے چہرے پر تشویش کا اظہار نمایاں تھا۔ کہنے لگیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ کمونسٹ دور میں ہمارے

مذہبی عقائد اور ہماری ثقافت کو کچلنے کی کوشش کی گئی لیکن تاجک خواتین کو اس بات کا احساس ہے کہ اس دور میں انھیں اور ان کے بچوں کو تعلیم کی بھرپور سہولتیں حاصل ہوئیں۔ خواتین کو مردوں کے مساوی حقوق ملے اور روزگار کا برابر کا حق نصیب ہوا۔ پھر انھوں نے مسکراتے ہوئے شرف جان کی طرف دیکھا جو باتوں سے زیادہ پلاؤ کھانے میں محو تھے اور کہنے لگیں کہ اس دور میں ایک سے زیادہ شادی ممنوع قرار دے دی گئی تھی اور جہیز کی لعنت ختم ہو گئی تھی۔

تو کیا اب آزادی کے بعد انھیں خطرہ ہے کہ تاجک خواتین ان تمام حقوق سے محروم ہو جائیں گی؟

میرے اس سوال پر گل رخسار محض مسکرا دیں اور پلاؤ کی قاب میری طرف بڑھا دی۔

اچانک میری نظر کونے میں ایک میز پر رکھے رسالے پر پڑی' یہ رستاخیز پارٹی کا ہفت روزہ "رستاخیز" تھا۔۔ یہ تھا تو فارسی میں لیکن رسم الخط اس کا روسی تھا۔ اس کے سرورق پر ممتاز قوم پرست تاجک شاعر بازار صابر کی نظم سرود رستاخیز چھپی ہوئی تھی۔ جو یوں شروع ہوتی تھی:

زمانہ آتش

زمانہ رستاخیز

زمانہ سرخ

زمانہ تیز

شرف جان کے بیٹے قناعت نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ کو روسی رسم الخط میں فارسی کے اس رسالہ پر تعجب ہو رہا ہے؟ بات یہ ہے کہ کمیونسٹ دور میں ۱۹۲۶ء میں آذر بائی جان کے دارالحکومت باکو میں ایک کانگریس ہوئی تھی جس میں روسی ترکستان کی تمام زبانوں کا عربی رسم الخط بدل کر لاطینی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن ۳۹ء میں آخر کار روسی رسم الخط اختیار کیا گیا۔۔ اب آزادی کے بعد دوبارہ فارسی کا رسم الخط اپنایا جا رہا ہے۔

قناعت کہہ رہے تھے کہ عربی رسم الخط ترک کیے جانے سے تاجکستان کے لوگ، خاص طور پر نوجوان، رودکی، جامی، حافظ اور فردوسی کی شاعری سے بے بہرہ ہو گئے اور اس کے ساتھ مذہبی لٹریچر سے بھی ان کا کوئی ربط نہیں رہا۔۔۔۔ قناعت نے فارسی رسم الخط والا ایک ہفت روزہ "پیوند" کا ایک شمارہ مجھے دکھایا۔

"پیوند" میں ذرا ٹھٹکا۔ جی ہاں، قناعت نے کہا کہ اس کے معنی اتحاد کے ہیں۔ میں نے سوچا کہ ایک ہی لفظ، کے فارسی اور اردو میں کس قدر مختلف معنی ہیں۔

ہفت روزہ پیوند کے اس شمارہ میں حافظ شیرازی کی ایک غزل اور فردوسی کے شاہنامے کی تشریح تھی اور قرآن پاک کے بارے میں ایک مضمون تھا۔

دوشنبہ میں حال میں ' اسلامی جمہوریہ ایران کے ایک ناشر ادارے نے کتب خانہ کھولا ہے۔ پیوند کے شمارے میں اس کے بارے میں بھی ایک مضمون شامل تھا۔

فارسی کے تعلق سے تاجکستان، ایران سے خاص جذباتی قرب محسوس کرتا ہے اور غالباً اسی بنا پر ایران نے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں سب سے پہلے یہاں اپنا سفارت خانہ کھولا ہے جو پارلیمنٹ کی عمارت کے بالکل بغل میں ہے اس سڑک کا نام بھی تہران اسٹریٹ رکھا گیا ہے۔

تو آزاد تاجکستان ' ایران اور افغانستان سے جو خاصی قربت محسوس کرتا ہے اس کا اظہار، رمضان المبارک کی چاند رات کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تاجکستان کے مذہبی پیشوا، قاضی اکبر تورے زادہ کی تقریر میں نمایاں تھا۔

آزادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ تاجکستان کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر رمضان المبارک کے آغاز پر قاضی صاحب کو عوام سے خطاب کا موقع دیا گیا۔

گو تاجکستان کی ایران کے ساتھ سرحد نہیں ملتی لیکن اقتصادی طور پر ایران۔۔۔۔ تاجکستان کے لیے بے حد اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے دنوں تاجکستان کے سابق صدر رحمان نبی ایف اپنے سب سے پہلے غیر ملکی دورہ میں ایران اور اس کے بعد پاکستان گئے تھے۔ پاکستان کے ساتھ اقتصادی روابط میں اب تک افغانستان کا مسئلہ حائل رہا ہے لیکن، افغانستان میں نجیب اللہ کی حکومت کے زوال اور مجاہدین کے

برسراقتدار آنے کے بعد اب افغانستان کے راستے پاکستان سے اقتصادی روابط استوار کرنے آسان ہو گئے ہیں۔

ویسے تاجکستان کے ' ماہر اقتصادیات' خود کامحمد عمروف کہتے ہیں کہ ہندوکش اور ہمالیہ کی وجہ سے افغانستان کے راستے بحرہند تک سڑک کی تعمیر اگلے دس سال تک مشکل نظر آتی ہے--- عمروف کا کہنا ہے کہ تاجکستان جس کا ۹۰ فی صد علاقہ پہاڑوں پر مشتمل ہے پہلے ہی وسط ایشیا کی تمام سابق سوویت جمہوریاؤں میں سب سے غریب جمہوریہ تھی۔ اب صورت حال اس وجہ سے اور سنگین ہے کہ ماسکو سے اسے جو مالی اعانت ملتی تھی وہ اب بند ہو چکی ہے اور کپاس سے متعلق جو صنعتی پیداوار تھی وہ ۸۷ء کے بعد میں اب آدھی رہ گئی ہے۔ اب اس کے پاس محض برآمد کے لیے کپاس اور المونیم رہ گیا ہے یا کچھ بجلی بھی برآمد کی جا سکتی ہے۔

تاجکستان نے آزادی کے بعد' بازار کی معیشت تو اختیار کی ہے لیکن اس شعبہ میں اسے بالکل تجربہ نہیں اور نہ اس کے پاس ماہر ہیں۔

بلاشبہ اس وقت تاجکستان کی معیشت کی بقا کے لیے بڑے پیمانے پر غیر ملکی سرمایہ کی ضرورت ہے ورنہ تاجکستان کو سنگین بے روزگاری اور غربت کا سامنا ہے اور اس وقت جب کہ اس کی سیاست' سخت بھنور میں گرفتار ہے' عوام کی بے چینی' ملک میں ایسا خلفشار پیدا کر سکتی ہے کہ جس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

بابائے سیب

تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبہ سے جب پرواز قزاقستان کے دارالحکومت الماعطا کے لیے روانہ ہوئی تو ایروفلوٹ کا طیارہ آناً فاناً دوشنبہ کی وادی پیچھے چھوڑ، پامیر کے اونچے اونچے پہاڑوں کی یخ بستہ فضا میں جا پہنچا--- پامیر کے یہ پہاڑ اپنی بلندیوں کی بنا پر دنیا کی چھت کہلاتے ہیں--- انہی میں دور مشرق کی سمت سابق سوویت یونین کی سب سے اونچی چوٹی نظر آ رہی تھی جو ۱۹۳۳ء میں سوویت کوہ پیما-- ابولا کوف نے سر کی تھی اور نام اس کا اس زمانے میں "پیک اسٹالنا" رکھا گیا تھا--- پامیر کے یہ پہاڑ، ان کی چوٹیاں، ان کے دامن، ان کی گھاٹیاں اور یہ وادیاں، سب برف سے ڈھکی ہوئی تھیں--- گو مارچ کا سورج اپنی پوری تمازت کے ساتھ چمک رہا تھا لیکن اس کی کرنیں، شیشے ایسی اس برف سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ رہی تھیں کہ یہ کبھی نہ پگھلنے والی ابدی برف کہلاتی ہے۔

دور تاحد نظر، پامیر کی چوٹیاں، گھاٹیاں اور وادیاں مجھے بے حد پراسرار نظر آ رہی تھیں۔ بہت سی تو ان میں ایسی ہوں گی کہ جہاں شاید کبھی انسان کا گذر تک نہیں ہوا ہو گا--- میں سحرزدہ انداز سے ان پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ کاش یہ طیارہ نیچے اتر جائے اور میں ان برف پوش پہاڑوں کو چھو لوں--- مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ پہاڑ بھی تجسس بھری نگاہوں سے ہمارے اس طیارہ کو دیکھ رہے ہوں کہ کون اس میں بیٹھا ہے؟ کہیں اس میں فضائی قزاق تو نہیں؟

نہ جانے قزاق کا لفظ رہ زن اور لٹیرے کا بھیس بدل کر کب اور کیسے اردو زبان میں در آیا ہے حالانکہ خود قزاقوں کی زبان میں اس لفظ کے معنی بالکل مختلف ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تاشقند یونیورسٹی کے اردو کے شعبہ کے سربراہ پروفیسر آزاد شماتوف سے جب میں نے قزاق لفظ کے اصل معنی پوچھے تھے تو انہوں نے بتایا تھا کہ اس کے معنی بالکل مختلف ہیں جو اردو ادب میں ہیں۔

ان کا کہنا تھا کہ قزاقی زبان میں قزاق کا مطلب وہ لوگ جو اپنے قبیلہ سے بچھڑ گئے ہوں --- یا الگ ہو گئے ہوں۔ قزاق خانہ بدوش قبائل تھے جو چھٹی صدی میں شمال مشرق سے آکر "تین شین" کے پہاڑوں کے دامن میں دشت نوردی کرتے تھے۔ یہ بہادر اور جنگ جو قبائل تھے۔ بارہویں صدی میں چنگیز خان نے انہی قبائل سے اپنی وہ فوج مرتب کی تھی جس نے شمال میں سائبیریا کے میدانوں تک اپنی فتح کے جھنڈے لہرائے اور مغرب میں بحر اسود تک روس کے علاقہ پر اپنا تسلط جمایا --- قزاقوں ہی کی فوج کے ساتھ چنگیز خان کا پوتا "باتو" کیف تک جا پہنچا تھا جو اس زمانے میں روس کا شاہی پایہ تخت تھا۔ اس کی فوج نے چند دنوں میں کیف کو ملبہ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا تھا۔

پندرہویں صدی میں قزاق قبائل نے اس وقت قوم کی شناخت حاصل کی جب ان کے سرداروں نے جو "باتیر" کہلاتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کیں۔ قزاق لفظ "باتیر" بھی اردو میں ہے جس کا تلفظ "بہادر" ہے اور معنی بھی قزاقی زبان میں بہادر ہی کے ہیں --- سردار کی رعایا کو قزاقی میں "شروا" کہتے ہیں جو غالباً اردو میں "چرواہا" بن گیا۔

اور تو اور خود لفظ اردو بھی قزاقی لفظ ہے --- اسلام آباد یونیورسٹی میں وسط ایشیا کے مطالعہ کے شعبہ کے سربراہ ڈاکٹر احمد حسن دانی اس لفظ کے منبع کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قزاقی زبان میں خانہ بدوشوں کے کیمپ کو "ہوردہ" کہا جاتا ہے۔ اور اس کیمپ میں ان کے خیمہ کو بھی ہورت کہتے ہیں۔ یہی لفظ۔ انگریزی میں "ہورڈ" بن گیا۔ اور چونکہ اردو نے فوج کے کیمپوں میں جنم لیا۔ اس لیے اردو بھی

"ہورت" اور پھر اردو کہلانے لگی۔

کہاں بارھویں صدی میں قزاقوں کی مدد سے چنگیز کے پوتے باتو نے پورے روس پر حکمرانی کی تھی اور کہاں ۱۷۳۶ء میں قزاق سردار ابوالخیر خان نے چینی مسلم قبیلے ڈونگن کے دباؤ سے گھبرا کر زار روس کی امان مانگی اور باقاعدہ روسی شہریت کی درخواست کی۔ یہ آغاز تھا۔ قزاقستان اور اس کے بعد پورے وسط ایشیا پر زار روس کے تسلط کا۔

ایرافلوٹ کا طیارہ اب Issyk Kul کی وسیع جھیل کے اوپر پرواز کر رہا تھا۔۔۔ مشرق میں تین شین کے پہاڑوں کا سلسلہ، چین کی سرحد پر دیوار کی طرح کھڑا تھا۔ جھیل کے عین شمال سے قزاقستان کا وسیع و عریض علاقہ شروع ہوتا ہے جو شمال میں مغربی سائبیریا کے میدانوں تک جاتا ہے۔ مشرق میں الٹائی پہاڑوں تک۔۔۔ اور مغرب میں ایک طرف روس کی والگا وادی تک اور دوسری طرف بحیرہ کیسپین تک پھیلا ہوا ہے۔

قزاقستان کے اعداد و شمار نہایت مرعوب کن ہیں۔ قزاقستان کا رقبہ پورے برصغیر پاک و ہند سے بھی بڑا ہے۔ اس کی زمین میں فرانس ایسے پانچ ملک سما سکتے ہیں۔ کل رقبہ ۲۷ لاکھ ۱۷ ہزار تین سو مربع کلو میٹر ہے اور آبادی صرف ایک کروڑ ۳۰ لاکھ ہے۔

طیارہ جب الماعطا میں اتر رہا تھا تو وسیع و عریض قزاقستان کا دارالحکومت تین شین کے پہاڑوں کے دامن میں ایک چھوٹی سی وادی میں گھرا ہوا نظر آیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس جمہوریہ کے حکمرانوں نے ملک کی بے کراں وسعت سے گھبرا کر یہاں انتہائی مشرقی سرے پر پناہ لی ہے۔

اس وقت برف گر رہی تھی۔ الماعطا کے ہوائی اڈے کی عمارت کے سامنے ٹیکسی والے مسافروں کی تاک میں ایسے کھڑے تھے جیسے برصغیر کے ریلوے اسٹیشنوں کے

باہر تانگے والے کھڑے رہتے ہیں اور اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی مسافروں پر جھپٹ پڑتے ہیں۔

میں سامان لیے باہر نکلا ہی تھا کہ اچانک ایک بڑے میاں نے جو اپنی عمر سے کہیں زیادہ تندرست و توانا نظر آتے تھے میرا سامان تھام لیا۔ شکل ان کی منگولوں جیسی تھی لیکن چہرے پر غیر معمولی طور پر گھنی سفید مونچھیں اسٹالن کے انداز سے سجی ہوئی تھیں۔۔۔ بڑے میاں اپنی ٹیکسی کی طرف مجھے یوں لے چلے کہ جیسے وہ خاص طور پر مجھے لینے پر مامور کیے گئے ہوں۔ ان کی یہ ادا مجھے اتنی بھائی کہ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔۔۔ میرا سامان ٹیکسی میں رکھ کر اور مجھے اندر بٹھا کر وہ لپک کر ہوائی اڈے کی عمارت میں گئے اور چند لمحوں بعد ایک معمر خاتون اور ایک نوعمر لڑکے کو اپنے ساتھ لے آئے۔ خاتون میرے ساتھ پیچھے کی نشست پر اور لڑکا۔۔۔۔ سامنے ڈرائیور کی برابر کی نشست پر بیٹھ گیا۔

سامنے سڑک۔ گاڑیوں سے ٹپکتے ہوئے تیل اور ڈیزل کی وجہ سے کالی برف کی بدرو بن گئی تھی۔۔۔ بڑے میاں نے ٹیکسی ایسے چھپاکے کے ساتھ دوڑائی کہ جیسے وہی اکیلے اس سڑک پر ہوں۔۔۔۔ مجھے باہر کچھ نظر نہ آیا کیونکہ ٹیکسی کے شیشے' سڑک کی کالی گار کے چھینٹوں سے سیاہ تھے۔ مجبوراً ٹیکسی میں برابر بیٹھی ہوئی معمر خاتون کی طرف دیکھا۔ صرف مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔۔۔ میں ابھی اسی کشش و پنج میں تھا کہ ان سے کیا بات کروں کہ تھوڑی دور جا کر ٹیکسی رک گئی۔ خاتون کے ساتھ جو لڑکا تھا وہ "افیدا زین" کہہ کر اتر گیا۔ مجھے تعجب ہوا۔۔۔ الما عطا اور جرمنی زبان میں خدا حافظ؟۔۔۔ میں نے خاتون سے ٹوٹی پھوٹی جرمنی زبان میں پوچھا کہ کیا وہ جرمن ہیں؟ انہوں نے شستہ انگریزی میں جواب دیا۔۔۔ ہاں۔۔۔ مجھے متعجب دیکھ کر انہوں نے بتایا کہ وہ ایک عرصہ' انگریزی کی مترجم رہ چکی ہیں۔ اب وہ ریٹائرڈ ہیں۔ عمر بھی ان کی اچھی خاصی تھی۔ یہی کوئی اسی برس کے لگ بھگ ہو گی۔

ٹیکسی' شاہراہ سے لکڑی کے بنے ہوئے خوبصورت بنگلوں کی بستی میں داخل ہو گئی۔۔۔ بنگلے برف سے ڈھکے ہوئے تھے اور سڑک برف سے اٹی ہوئی تھی۔ ایک بنگلہ

کے سامنے ٹیکسی رک گئی۔ خاتون یہاں اتر رہی تھیں۔۔۔ میں ان کے لیے دروازہ کھولنے کے لیے اپنی طرف کے دروازے سے اترا تھا کہ برف میں پیر پھسل گیا اور میں چاروں شانے چت، سڑک پر دھم سے گر پڑا۔

بڑی بی اور ٹیکسی ڈرائیور بڑے میاں نے لپک کر مجھے اٹھایا۔ مجھے ایسا لگا کہ پیر میں موچ آگئی ہے۔ خاتون کا حکم کے انداز میں اصرار تھا کہ میں ان کے بنگلہ میں چل کر کچھ دیر آرام کرلوں اور پیر سینک لوں۔

بنگلہ کے اندر کمرہ نہایت صاف ستھرا اور ہر چیز باقاعدہ اور سلیقہ سے اپنی جگہ رکھی ہوئی تھی۔ ایسا لگا کہ جیسے یہ کمرہ الماعطا میں نہیں۔۔۔ بون، برلن یا کولون کے فلیٹ کا کمرہ ہے۔ جرمنیت کمرہ پر غالب تھی۔

میں نے خاتون سے پوچھا کہ وہ یہاں الماعطا کیسے اور کب آئی تھیں؟ کہنے لگیں یہ لمبی داستان ہے۔ پہلے سوپ پی لو۔ ٹیکسی والے بڑے میاں بھی۔ اپنے برف آلود جوتے کمرے کے باہر اتار کر آتش دان کے سامنے براجمان ہو گئے تھے۔ بڑی بی کا نام ڈوروتھی تھا۔ کہنے لگیں کہ ان کے آباواجداد۔ اٹھارہویں صدی میں جرمنی سے آکر روس میں والگا کی وادی میں بسے تھے۔۔۔ وہ زمانہ پیٹر دی گریٹ کا تھا جب اس نے پورے یورپ سے کاریگر روس بلوائے تھے۔ والگا کی وادی میں جرمنوں کی اتنی بڑی آبادی ہو گئی تھی کہ باقاعدہ والگا جرمن ری پبلک کے نام سے سویت جمہوریہ تشکیل دی گئی تھی۔۔۔ لیکن جب ۱۹۴۱ء میں ہٹلر نے سویت یونین پر حملہ کیا تو اسٹالن نے یہ جمہوریہ توڑ دی اور اس علاقہ کے تمام جرمنوں کو جبراً دور دراز علاقوں میں منتقل کر دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ یہ جرمن کہیں ہٹلر کا ساتھ نہ دیں۔

ڈوروتھی کہہ رہی تھیں کہ کئی لاکھ جرمنوں کے ساتھ ان کے والدین کو بھی جبراً الماعطا بھیج دیا گیا۔ البتہ ان کے تین بھائیوں کو ان سے جدا کر دیا گیا اور اب تک انہیں ان کا پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ زندہ بھی ہیں یا جنگ میں مارے گئے۔۔۔ ڈوروتھی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔۔۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اسٹالن کے گناہوں میں یہ سب سے بڑا گناہ تھا کہ اس نے جرمنوں کو بے گھر کیا، روس اور یوکرینی باشندوں کو جبراً قزاقستان

اور وسط ایشیا کی دوسری جمہوریاؤں میں یوں بکھیر دیا کہ جیسے وہ انسان نہ ہوں- بچ ہوں--- انسان کے دماغ میں یہ بات سما گئی تھی کہ یوں مختلف نسلوں کو اتھل پتھل کر کے اور انھیں خلط ملط کر کے ایک سویت قوم بنائی جا سکتی ہے-

ڈورتھی کہہ رہی تھیں کہ قزاقستان میں دس لاکھ کے قریب جرمنی ہیں اور نصف صدی ہونے کو آئی ہے یہ جرمن اپنی زبان' اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت کو ایسے برقرار رکھتے رہے ہیں کہ ایک دن انھیں اپنے وطن واپس جانا ہے-

کون سے وطن ؟ میں نے پوچھا-

ڈورتھی بڑے فخر سے کہنے لگیں کہ اب تو یہاں کے سب جرمن' جرمن جانا چاہتے ہیں-

میں نے پوچھا کہ روسی کتنے ہوں گے' قزاقستان میں؟

انھوں نے بتایا کہ کل ۱۶ ملین کی آبادی میں ۳۷ فیصد سے زیادہ ہیں-

تو پھر قزاق کتنے ہیں- قزاقستان میں؟

انھوں نے کہا کہ ۳۸ فی صد-

میں نے تعجب کا اظہار کیا کہ قزاق' خود اپنے ملک میں اقلیت میں ہیں--
ڈورتھی نے کہا کہ لیکن یوغور' ازبک اور کرغیز مل کر اس علاقہ کے لوگوں کی آبادی اچھی خاصی بن جاتی ہے-

میں نے پوچھا کہ الماعطا' آپ کو کیسا شہر لگتا ہے؟

کہنے لگیں کہ معلوم ہے تمہیں کہ الماعطا کے کیا معنی ہیں قزاقی زبان میں؟

نہیں-- میں نے اعتراف کیا-

کہنے لگیں-- Father of Apple

میں سوچنے لگا کہ اس کا اردو میں کیا ترجمہ ہو گا-- بابائے سیب؟

ڈورتھی کہنے لگیں کہ یہاں کے سیب لاجواب ہوتے ہیں- کہیں اور کا سیب' اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا- میں نے کہا کہ ذرا ٹھہریئے- اتنی دلچسپ باتیں میں ٹیپ پر ریکارڈ کر لوں- میرا ٹیپ ریکارڈر- میرے سامان کے ساتھ ٹیکسی میں ہے-

انہوں نے بڑے میاں کی طرف دیکھا جو آگ کے سامنے اونگھ رہے تھے۔ پھر مسکرا کر کہنے لگیں کہ مجھے یقین ہے کہ مجھ سے کہیں زیادہ دلچسپ انداز سے تم اپنے سامعین کو یہ باتیں بتا دو گے۔

پھر بلا کسی توقف کے کہنے لگیں کہ الماعطا ۱۸۵۴ء سے ۱۹۲۱ء تک Verny کے نام سے مشہور تھا۔ ورنی کا مطلب ہے "وفادار"۔۔۔ اور یہاں زار روس کے زمانے میں نہایت وفادار فوجی بھیجے جاتے تھے۔ لیکن ان کے ساتھ اسٹالن نے اپنے مخالفین کو بھی یہاں خانہ بدر کیا جن میں ٹراٹسکی بھی شامل تھے۔ ملک بدر کیے جانے سے پہلے ٹراٹسکی کچھ سال الماعطا میں ہی رہے تھے۔

ڈورتھی کہہ رہی تھیں کہ الماعطا میں ۱۸۸۷ء میں تباہ کن زلزلہ آیا تھا جس میں پورا شہر تہس نہس ہو گیا تھا۔

اس کے بعد بیشتر گھر، لکڑی کے بنائے گئے اور ہر مکان والے کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے گھر کے سامنے ایک درخت لگائے۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ آج یہ شہر نہایت سرسبز اور خوبصورت ہے۔

اور ہاں۔۔۔ کہنے لگیں کہ الماعطا میں تم شہر کے بڑے پارک میں دوسری عالم گیر جنگ کے ان ۲۸ شہیدوں کی یادگار ضرور دیکھنا جنھوں نے ماسکو کا دفاع کیا تھا اور نازی حملہ روکا تھا۔ ان سب کا تعلق قزاقستان سے تھا۔ کہنے لگیں کہ اسی پارک میں لکڑی کا وہ مشہور گرجا گھر ہے جس میں ایک کیل بھی استعمال نہیں کی گئی۔ اور الماعطا کے قریب ہی دنیا کا سب سے اونچا اسکیٹنگ مرکز ہے۔ وہاں بھی ضرور جانا۔ اور جب میں ڈورتھی سے رخصت ہو رہا تھا تو وہ نہایت شفقت اور محبت کے ساتھ ہدایت دے رہی تھیں کہ ان سے ملے بغیر میں الماعطا سے نہیں جاؤں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا۔ "نیورلش کے اش" آفیتا زین۔"

باب ۱۷

جوہری قلعہ

قزاقستان کے دارالحکومت الماعطا کے مقامات میں لکڑی کے بنے ہوئے بنگلوں کی نہایت خوبصورت بستی سے جرمن خاتون' ڈورتھی سے رخصت لینے کے بعد جب میں شہر کے مین وسط میں' سب سے بڑے پارک کے سامنے اترا۔ ہوٹل پہنچا تو ہوٹل کی عمارت پر سبز پاکستانی پرچم لہراتا ہوا دیکھ کر مجھے سخت تعجب ہوا۔۔۔۔ اندر پتہ چلا کہ پاکستان نے اسی ہوٹل میں اپنا سفارت خانہ قائم کیا ہے۔ سفارت خانہ کے سربراہ ناظم الامور خالد خٹک تھے۔۔۔۔ سربراہ کیا وہی اکیلے سب کچھ تھے۔۔۔۔ اس سے پہلے وہ ماسکو کے سفارت خانہ میں تھے اور سابق سوویت یونین کے امور کے ماہر مانے جاتے ہیں۔۔۔۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے دور دنیا کے ایک سرے پر اس برف پوش الماعطا میں وہ اکیلے قلعہ سنبھالے ہوئے ہوں۔ ناظم الامور کے اعلیٰ عہدے کی نسبت سے اور اپنی عمر کے مقابلے میں' خالد خٹک بہت زیادہ نوجوان نظر آتے تھے۔۔۔ مسکراہٹ چہرے پر پوری فراخ دلی سے پھیلی ہوئی تھی۔ مجھ سے ایسے والہانہ انداز سے ملے کہ جیسے وہ ایک طویل عرصہ سے میرا انتظار کر رہے ہوں۔ ایک تو مہمان نواز پٹھان پھر ان پر سفارتی پانی چڑھا ہوا۔ بہت خاطر مدارات کی۔

امریکہ اور چین کے بعد پاکستان تیسرا ملک ہے جس نے الماعطا میں اپنا سفارت خانہ قائم کیا ہے۔ سفارت خانوں کے قیام کے سلسلہ میں دو بڑی مشکلات ہیں' ایک تو آزادی سے پہلے قزاقستان کو غیر ملکی تعلقات اور سفارتی روابط کا قطعی کوئی تجربہ نہیں

تھا۔۔۔۔ آزادی کے تین ماہ بعد' قزاقستان کی وزارت خارجہ' وزیر خارجہ سمیت صرف ۴۴ افراد کے عملہ پر مشتمل تھی۔۔۔۔ دوسری بڑی مشکل سفارت خانہ کی عمارتوں کے سلسلہ میں تھی۔۔۔۔ الماعطا میں عمارتیں یا تو بہت بڑی محل نما ہیں یا پھر' بہت چھوٹی ۔۔۔۔ بیشتر عمارتیں سرکاری ہیں یا پھر کمونسٹ پارٹی کی ملکیت ہیں۔

پاکستان نے الماعطا میں سفارت خانہ قائم کرنے میں قدرے عجلت سے کام لیا ہے کیونکہ گذشتہ فروری ۱۹۹۲ء میں' صدر نور سلطان نذر باشیف' پاکستان کے دورے پر گئے تھے۔۔۔۔ الماعطا میں پاکستانی سفارت خانہ نے پہلا ویزا' صدر نور سلطان نذر باشیف اوران کی بیگم سارہ کو جاری کیا تھا۔۔۔۔ گو ۔ صدر مملکت کو ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن پتہ چلا کہ صدر نور سلطان نذر باشیف' اس علامتی اظہار پر مصر تھے۔

نہ جانے کیوں میرا دل' قزاقستان کی آزادی کے بعد کے موجودہ حالات اور مسائل سے فی الحال اچاٹ تھا اور قزاقستان کی پرانی تاریخ کے بارے میں سوالات بار بار میرے ذہن میں جواب کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔

قزاق' جن کا ملک یورپ سے لے کر چین کی سرحد تک پھیلا ہوا ہے اور جنہوں نے چنگیز خان کے ساتھ مل کر ایک زمانے میں بڑی حد تک پورے روس پر حکمرانی کی ہے' آخر پہلے زار روس اور پھر کمونسٹ نظام کے زیر تسلط کیسے آ گئے۔ کس طرح ان دو ادوار میں پہاڑوں اور مرغزاروں کی دشت نوردی کرنے والے ان آزاد منش قزاقوں کو زیر کیا گیا۔

یہ سوال جب میں نے خالد خٹک سے کیا تو انہوں نے کہا کہ زارروس کے تسلط سے پہلے منگولوں کے ساتھ ان کے جھگڑے تھے جن سے قزاق کافی کمزور ہو گئے تھے اور یہ زار روس کی توسیع پسندی کی مزاحمت نہ کر سکے۔۔ لیکن کمونسٹ دور میں خاص طور پر اسٹالن کے زمانے میں قزاقوں پر بہت ظلم و ستم کیا گیا۔۔ اسٹالن نے Collectivisation کا جو سسٹم شروع کیا اس میں ان بے چارے قزاقوں کو بہت زیادہ مصائب اٹھانے پڑے۔ قزاق زیادہ تر مال مویشی رکھ کر زندگی گزارتے تھے اور یہی ان

کی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ اسٹالن نے ان کی خانہ بدوشی کے خاتمے اور انھیں ایک جگہ بسانے کے لیے نہایت ظالمانہ طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ ان کے مال مویشی اکٹھا کر کے انھیں ان کے سامنے ختم کر دیا جاتا تھا اور انھیں ایک جگہ بسنے اور Collectivisation منظور کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔ اس عمل میں کافی لوگ مارے گئے۔۔۔ تعداد کئی لاکھ بنتی ہے۔۔۔ پھر دوسری عالم گیر جنگ میں جب نازی فوجیں' روس میں گھس آئیں اور ماسکو اور لینن گراڈ کے قریب پہنچ گئیں تو اس وقت لاکھوں کی تعداد میں قزاقوں کو محاذ پر بھیجا گیا اور پانچ لاکھ قزاق اس جنگ میں مارے گئے۔ پورے روس میں دو کروڑ کے قریب لوگ مارے گئے اس جنگ میں۔ ان میں پانچ لاکھ قزاق تھے۔ آبادی کے لحاظ سے دیکھیں تو جنگ میں ہلاک ہونے والوں میں قزاقوں کا تناسب بہت زیادہ تھا۔"

پھر اسٹالن نے والگا کی وادی کے جرمنوں' وسط روس کے تاتاریوں' یوکرینیوں اور بڑی تعداد میں روسیوں کو جبرا' قزاقستان منتقل کر کے' قزاقوں کی رہی سہی کمر توڑ دی۔ انھیں اپنے ہی وطن میں اقلیت بنا دیا۔

اس کے بعد خروشیف کا اقتصادی منصوبہ' قزاقستان کی معاشی تباہی کا باعث بنا' خروشیف کے اس منصوبہ کے تحت' قزاقستان میں کاشت کاری صرف کپاس کی فصل تک محدود کر دی گئی۔ اور کنواری زمین' کو استعمال کرنے کی شدت پسند مہم کے تحت مرغزاروں میں بھی ہل چلا دیے گئے۔ قزاقوں نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ صدیوں سے ان مرغزاروں کو صرف مویشی کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے اور یہی قدرت کی منشا ہے۔ لیکن کمونسٹ بقراطوں نے اس وقت ان کی بات یہ کہہ کر ٹھکرا دی کہ یہ جاہل خانہ بدوشوں کی اجڈ منطق ہے۔ ایک ربع صدی بعد آخر کار کمونسٹ بقراطیوں کو اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑا۔

صدر نور سلطان نذر باشیف' سابق کمونسٹ قیادت سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ سابق صدر گورباچوف کے نہایت بااعتماد ساتھی تھے۔ آخر وقت تک نذرباشیف سوویت یونین کا ڈھانچہ' کسی نہ کسی صورت میں برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جب

گذشتہ سال (۱۹۹۱ء) ماسکو میں اگست کی ناکام بغاوت کے بعد سوویت یونین نے آزاد جمہوریاؤں میں بکھرنا شروع کیا تو نذر باشیف نے بھی قزاقستان کی آزادی کا اعلان کیا اور کمونسٹ پارٹی کا نام بدل کر سوشلسٹ پارٹی رکھ دیا۔۔۔۔ تو کیا اس صورت حال میں قزاقستان کے عوام آزادی کے بعد کوئی تبدیلی محسوس کرتے ہیں؟

انور علیم خانوف' قزاقستان کے مشہور ادیب اور شاعر ہیں۔ فیض صاحب اور برصغیر کے ادیبوں اور شاعروں سے ان کے قریب ترین روابط ہیں۔ میں نے یہ سوال جب ان سے کیا تو انہوں نے کہا کہ دوسری جمہوریاؤں میں بھی تو پرانی کمونسٹ قیادت برسراقتدار ہے۔۔۔۔ انور علیم خانوف نے کہا کہ قزاقستان کی صورت حال دوسری جمہویاؤں سے قدرے مختلف ہے۔ دوسری جمہوریاؤں میں بڑی حد تک ایک ہی قوم بستی ہے۔ لیکن قزاقستان میں متعدد قومیں آباد ہیں۔۔۔۔ صدر نذر باشیف' سابق کمونسٹ رہنما سہی لیکن اب ان کا تعلق کسی جماعت سے نہیں ہے۔۔۔۔ اس وقت بلاشبہ قزاقستان میں سب سے بڑی اور منظم جماعت سوشلسٹ پارٹی ہے جس کی قیادت اجتماعی ہے۔۔۔۔ حزب مخالف میں گو آلاش کو قزاق قوم پرست تحریک کہا جا سکتا ہے اور یہ منظم جماعت نہیں البتہ آزاد سوومنٹ اور نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی' حزب مخالف کی جماعتیں ہیں جو پارلیمنٹ میں ان ۸۵ اراکین کے استعفیٰ کا مطالبہ کر رہی ہیں جو کمونسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔ حزب مخالف' قومی حکومت کی تشکیل کا بھی مطالبہ کر رہی ہے۔

انور علیم خانوف کا کہنا ہے کہ "فی الحال صدر نذر باشیف کو حزب مخالف سے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔"

لیکن بلاشبہ' صدر نذر باشیف کو سب سے بڑا خطرہ اقتصادی مسائل سے ہے۔ گو ان کی حکومت نے نج کاری کا پروگرام شروع کیا ہے لیکن پرانے کمونسٹ بیوروکریٹس کو اب بھی حکومت کی مختلف سطحوں پر کنٹرول حاصل ہے۔۔۔ پھر ملک میں غیر ملکی سرمایہ کاری اور تجارت کے ماہرین کی بہت کم تعداد ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک الماعطا میں صرف ایک Casino کے قیام جو ایک امریکی کمپنی نے کھولا ہے اور

میکڈانلڈ کی طرح کوریا کی ایک کمپنی کے ریستوران Shagi کے قیام کو نج کاری کا مظہر قرار دیا جا رہا ہے۔

قزاقستان میں روسیوں کی تعداد ۳۷ فی صد ہے۔ وزیر اعظم بھی روسی نژاد ہیں۔ پھر شمال میں روس کے ساتھ لمبی سرحد ہے۔ اور اس علاقہ میں زیادہ تر روسی آباد ہیں--- بلا شبہ صدر نور سلطان نذر باشیف کو اس بات کا بخوبی احساس ہے اور غالباً یہ احساس' ان کی پالیسیوں پر پوری طرح حاوی ہے---- صدر نذر باشیف کا کہنا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ قزاقستان' یوری برادری کا رکن بنے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ وسط ایشیا کی دوسری جمہوریائیں تو پاکستان' ایران اور ترکی کے اقتصادی تعاون کے ادارے ECO میں شامل ہوئی ہیں لیکن قزاقستان اس سے الگ رہا ہے۔

تو کیا مطلق' صدر نذر باشیف مسلم ممالک سے فاصلہ رکھنا چاہتے ہیں؟ خالد خٹک اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ نہیں ایسی بات نہیں' صدر نذر باشیف اسلامی ملکوں سے تعلقات بڑھانا چاہتے ہیں۔ وہ پاکستان گئے تھے۔ کئی سمجھوتوں پر دستخط کیے' اس طرح ترکی کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بڑی تیزی سے بڑھے ہیں--- سعودی عرب سے بھی اقتصادی تعاون میں اضافہ ہوا ہے اور البرکہ بینک نے الماعطا میں کام کرنا شروع کیا ہے۔"

قزاقستان کی وسعت سے فائدہ اٹھا کر یہاں سابق سوویت یونین کے زمانے میں خلائی مرکز قائم کیا گیا تھا اور اسے جوہری تجربوں کا بھی گڑھ بنایا گیا تھا۔ ماحولیات پر اور قزاقوں کی صحت پر اس کے مہلک اثرات کے بارے میں ابھی تک حقیقی تصویر سامنے نہیں آئی ہے۔

جوہری اسلحہ کی تنصیبات کی بدولت' قزاقستان کو بین الاقوامی سیاست میں بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اس وقت ایک اندازے کے مطابق قزاقستان کی سرزمین پر دو ہزار جوہری بم ہیں' جن میں سے چندرہ بم دور مار میزائلز میں نصب ہیں یا لمبی مار والے بمبار طیارے ان سے لیس ہیں۔ اس کی وسعت اور اس کی جغرافیائی حیثیت کے لحاظ سے بھی اہمیت حاصل ہے۔ ایک طرف مغرب میں روس کے ساتھ اس کی

ہزاروں میل لمبی سرحد ہے۔ جنوب میں وسط ایشیا کی دو اہم جمہوریائیں کرغیزیہ اور ازبکستان ہیں اور مشرق میں اس کی سرحد، چین کے سین جیانگ علاقہ سے ملتی ہیں۔

آزادی کے بعد الماعطا میں بڑی تعداد میں چینی تاجر نظر آتے ہیں جو سن جیانگ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ علاقہ اب بھی مشرقی ترکستان کہلاتا ہے۔ یہاں زیادہ تر "یوغور" نسل کے افراد آباد ہیں جن کی تعداد ستر لاکھ بتائی جاتی ہے۔ انہی کے ساتھ دس لاکھ قزاق اور پچاس لاکھ "دونگن" چینی مسلمان آباد ہیں۔ ان نسلوں کے خاندان سرحد کے دونوں طرف بٹے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چین کو قزاقستان کی آزادی کے بعد سن جیانگ میں آزادی کی تحریک کے زور پکڑے جانے پر تشویش ہے۔

چینی ترکستان کے وہ مسلمان جو چین میں کمونسٹوں کے برسراقتدار آنے کے بعد تبت اور ہندوستان کے راستے ترکی اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں نقل وطن کر گئے تھے وہ اب بڑی تعداد میں قزاقستان آ رہے ہیں اور نہ صرف قزاقستان میں سرمایہ لگا رہے ہیں بلکہ سن جیانگ میں آزادی کی تحریک کی بھی مدد کر رہے ہیں۔

ان میں سے ایک تاجر عثمان اوتائی ہیں جن کا آبائی شہر کاشغر ہے۔ چین میں کمونسٹوں کے اقتدار میں آنے کے بعد اپنے قبیلے کے ساتھ تبت کے راستے ہندوستان پہنچے تھے اور وہاں سے یہ پاکستان گئے اور وہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد ترکی منتقل ہو گئے۔ عثمان اوتائی اب سویڈن میں رہتے ہیں اور تجارت اور سرمایہ کاری کا جائزہ لینے الماعطا آئے ہیں۔ میں نے جب ان سے پوچھا کہ قزاقستان کی آزادی کے بعد اب وہ یہاں کے حالات کے بارے میں کیا سوچتے ہیں تو انہوں نے کہا میں دس سال پہلے قزاقستان آیا تھا اور اب میں آزادی کے بعد آیا ہوں۔ یہاں، سونا، پٹرول، اور چاندی اور دوسری قیمتی معدنیات ہیں۔ اگر قزاقستان کو سرمایہ مل جائے تو یہ اپنی اس دولت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور یہ ملک جو بے حد وسیع ہے اس پورے علاقے میں نہایت طاقت ور ملک بن سکتا ہے۔

باب ۱۸

آٹھ شادی شدہ بیٹوں کی دعا

مارچ کا آدھا مہینا گذر چکا تھا لیکن قزاقستان کے دارالحکومت الماعطا میں اب بھی بڑی شدت سے برف باری جاری تھی۔ اوترار ہوٹل سے جب میں نے گوگول اسٹریٹ کی دوسری طرف پارک کی جانب قدرے گھبرا کر دیکھا جس میں' دوسری عالم گیر جنگ میں ماسکو کے باہر نازی حملے کو روکنے والے ۲۸ سپاہیوں کی یادگار اور لکڑی کا بنا ہوا گرجا گھر برف سے ڈھک گیا تھا تو ممتاز قزاق شاعر انور علیم خانوف نے اپنے منگول ناک نقشے والے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا کہ یہ برف اچھی فصل کی نوید ہے۔ یہ آزادی کے بعد پہلی شان دار فصل ہوگی۔ قزاق شاعر کی رومانوی فکر' معیشت کی حقیقتوں میں کس قدر گتھی ہوئی تھی۔ میں یہ سوچ کر حیران رہ گیا۔

اوترار ہوٹل کے بغل والی سڑک' الماعطا کے بازار کی طرف جاتی ہے' اسی بازار کے پیچھے اس شہر کی باقی ماندہ واحد مسجد واقع ہے۔ یہ سڑک ڈھلواں ہے اور برف باری سے نہایت پر خطر بن گئی تھی صرف میرے لیے۔ کیونکہ دوسرے سب لوگ بڑے مزے سے ٹہلتے ہوئے اس سڑک سے یوں گذر رہے تھے کہ جیسے وہ اپنے گھر کے صحن میں ٹہل رہے ہوں۔ مجھے جھجکتا اور ٹھٹکتا دیکھ کر البتہ ان میں سے کچھ لوگوں کو تعجب ضرور ہو رہا تھا۔

مجھے لندن میں اپنی زندگی کی پہلی برف باری یاد آگئی۔ میں اپنی نادانی میں ربر کے گھسے ہوئے سول والا جوتا پہن کر برف میں نکل آیا تھا ——— سول ہل سے سڑک پیچھے

بالکل آبشار کی طرح جاتی ہے۔ اس پر میں نکل تو آیا تھا لیکن مجھے نہ آگے جانے کی ہمت ہوتی تھی اور نہ پیچھے لوٹنے کی تاب۔ میں بجلی کا کھمبا پکڑے سخت پریشانی کے عالم میں کھڑا تھا کہ ایک بڑے میاں میرے پاس آئے۔ پوچھنے لگے کہ موزے پہنے ہوئے ہو؟ میں جھنجلا اٹھا کہ یہ کیا بے تکا سوال ہے؟ بڑے میاں میری جھنجلاہٹ کو بھانپ گئے۔ مسکرا کر کہنے لگے کہ موزے اتار کر انھیں اپنے جوتوں پر چڑھا لو ---- یوں برف پر پھسلو گے نہیں اور صحیح سلامت سے اپنی منزل پر پہنچ جاؤ گے۔ بڑے میاں نے ترکیب بڑے پتے کی بتائی تھی۔

الماعطا میں البتہ مجھے اپنے موزے اتار کر جوتوں پر نہیں چڑھانے پڑے اور جیسے تیسے میں' شیشے ایسی برف کی نہر عبور کر کے جامع مسجد تک پہنچ گیا۔ میں یہ مسجد دیکھ کر ٹھٹکا۔ میں نے سوچا تھا کہ الماعطا کی یہ واحد مسجد بڑے سے گنبد اور میناروں والی وسیع و عریض اور عالی شان مسجد ہو گی لیکن یہ صرف ایک منزلہ' چھوٹی سی مسجد نکلی جس کا صرف ایک مینار تھا وہ بھی بالکل چھوٹا سا۔ اندر البتہ ایمان پرور منظر تھا۔ ایک طرف والان میں بہت سی بچیاں حجاب اوڑھے ایک قطار میں رحل کے سامنے بیٹھی' سپارے پڑھ رہی تھیں۔ مسجد کے اندر جا بجا خوبصورت قالین پڑے ہوئے تھے اور چند معمر افراد قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ مسجد کے ایک طرف ایک بڑے قطع پر زمین کھدی ہوئی تھی۔ یہاں سعودی عرب کی مالی مدد سے مسجد کی توسیع ہو رہی تھی۔

میں مسجد سے جب باہر نکلا تو سامنے بڑے سے احاطہ میں سیب کے درختوں کے نیچے چھوٹے چھوٹے اسٹولوں پر بیٹھے ہوئے قزاق' اٹھ کر بڑے والہانہ انداز سے مجھ سے بغل گیر ہوئے۔ یہ اپنی قزاقی زبان میں بڑی تیزی سے کچھ کہہ رہے تھے جو ظاہر ہے میں نہ سمجھ سکا لیکن ان کی عقیدت' ان کی محبت اور مجھ سے مل کر انھیں جو خوشی ہو رہی تھی اس کے اظہار کے لیے کسی زبان کی ضرورت نہیں تھی۔ ان قزاقوں میں سے بہت سے بوڑھے ایسے تھے جنھوں نے اسٹالن کا وہ دور دیکھا تھا جب قزاقستان میں تمام مساجد' مکتب اور مدرسے بند کر دیے گئے تھے اور جن علماء نے

اسٹالن کی Collectives کی پالیسی کی مخالفت یا مزاحمت کی تھی انھیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ لیکن اسٹالن کی استبدادی پالیسی' ان علماء کی مزاحمت کو نہ توڑ سکی۔ دینی مدرسے خفیہ طور پر جاری رہے اور آخرکار ۱۹۴۳ء میں سوویت حکومت کو قزاقستان میں اسلامی مرکز کے قیام کی اجازت دینی پڑی۔

آزادی کے بعد اب اسلام سے دلچسپی بڑی تیزی سے بڑھی ہے جو بہت سے لوگوں کی نظر میں احیاء اسلام ہے اور بہت سے لوگوں کے نزدیک' قزاق قوم پرستی کا نیا اظہار ہے۔ الما عطا میں پاکستان کے ناظم الامور خالد خٹک کی رائے ہے کہ قزاق قوم پرستی اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ قزاق قوم پرستی اور اسلام ایک دوسرے میں مربوط ہیں۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ آپ کو قزاقستان میں کوئی قزاق عیسائی یا یہودی نہیں ملے گا۔ قزاق سب کے سب مسلمان ہیں۔ اس لحاظ سے قزاق قوم پرستی اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں۔

میں نے خالد خٹک سے پوچھا کہ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں قزاقوں نے جب اسلام قبول کیا تو اجتماعی طور پر سب نے قبول کیا۔ وہ کہنے لگے کہ جی ہاں یہاں اسلام' تمام قزاقوں نے قبول کیا۔ یہاں صورت حال عرب ملکوں کی طرح نہیں جہاں مسلمانوں کے ساتھ عیسائی بھی ہیں اور یہودی بھی ہیں۔ قزاقستان میں' سب قزاق مسلمان ہیں یوں یہ اسلام میں پوری طرح سے مربوط ہیں۔

قزاقستان میں اسی انداز کی قوم پرستی کی علم بردار تنظیم --- الاش ہے جسے بہت سے مبصر' مسلم بنیاد پرستی کا نقیب سمجھتے ہیں۔ تو کیا واقعی قزاقستان میں مسلم بنیاد پرستی کا خطرہ ہے جس کا اظہار مغرب کے ساتھ' روس میں بھی بڑے زوروں سے کیا جا رہا ہے؟ یہ سوال جب میں نے قزاق شاعر اور دانشور انور علیم خانوف سے کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ محض مغرب کے خدشات ہیں جو صحیح نہیں۔ آزادی کے بعد' اسلام سے دلچسپی اور پڑوسی مسلم ممالک سے یک جہتی کو نہ تو مذہبی کٹر پن کہا جا سکتا ہے اور نہ بنیاد پرستی۔ پچھلے ستر (۷۰) برس میں قزاقستان کے معاشرہ میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ خواندگی کی شرح سو فیصد ہو چکی ہے --- لال کارواں یا لال کیمپ کے ذریعہ'

خواتین میں تعلیم بالغاں اور سیاسی تعلیم نے ایک نیا شعور دیا ہے۔ ۱۹۳۶ء تک قزاقستان کی ۷۵ فی صد خواتین ان پڑھ تھیں لیکن تین برس میں ہی' تعلیم یافتہ خواتین کی تعداد ۷۲ فی صد تک پہنچ گئی۔

انور علیم خانوف کہہ رہے تھے کہ کمونسٹ انقلاب سے پہلے خون کا بدلہ خون' چھوٹی عمر میں شادی اور دلہن کی قیمت۔ جو کلیام کہلاتی ہے ادا کرنے کی رسم تھی لیکن اب یہ رسومات ختم ہو چکی ہیں۔

پھر قزاقستان میں بڑی تعداد میں روسی' جرمن اور دوسرے "سلاو" بھی آباد ہیں۔ آبادی کا یہ توازن یقیناً مذہبی کٹرپن کی راہ میں حائل ہو گا۔

بلاشبہ' قزاقستان کے لیے موجودہ دور ایک عبوری دور ہے جس میں ایک طرف معیشت' مرکزی کنٹرول سے آزاد' کھلے بازار کی معیشت کا روپ دھار رہی ہے اور دوسری طرف معاشرہ پرانے کمونسٹ بندھنوں سے آزاد ہو رہا ہے' اس دور میں موجودہ قیادت' مستقبل کی راہ تراشنے میں اہم رول ادا کر رہی ہے۔

مجھے یاد آیا کہ تاشقند میں تابانی کارپوریشن کے کرتا دھرتا' عباس خان سے جب قزاقستان کی سیاست کے بارے میں بات ہو رہی تھی تو انہوں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ قزاقستان کے سربراہ نور سلطان نذر باشیف' نہایت منجھے ہوئے اور اعتدال پسند رہنما ہیں۔ ان کا خیال تھا نذر باشیف کی قیادت میں' قزاقستان بڑی تیزی سے ابھر کر بین الاقوامی میدان میں سامنے آیا ہے۔

اس سے پہلے اس پورے وسط ایشیا میں تاشقند کو اہمیت حاصل تھی اور وہی اس پورے علاقہ کا دل سمجھا جاتا تھا۔۔۔ لیکن اب نذر باشیف نے بہت جلد سیاسی اہمیت اور قوت حاصل کر لی ہے۔ نذرباشیف گوربا چوف اور ان کے پرانے پارٹی آپریٹس اور نئی ابھرتی ہوئی روسی قیادت' دونوں کے قریب تھی اور اس لحاظ سے انہوں نے پچھلے دو سال کے دوران۔ اپنے آپ کو بیلنسنگ پاور کے طور پر روشناس کرایا ہے۔

اس وقت اس پورے علاقہ میں دو نمایاں سیاسی رجحانات ہیں' ایک طرف ایسے

عناصر ہیں جو بڑی تیزی سے پرانے نظام کو ختم کر کے تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے عناصر ہیں جو پرانے نظام کو فی الفور ختم کرنا نہیں چاہتے۔ نور سلطان نذر باشیف ان دونوں رجحانات کے بین بین ہیں اور وہ اس اعتدال پسندی کی وجہ سے دنیا کی نظر میں ایک سلجھے ہوئے سیاست دان مانے جاتے ہیں۔"

غالباً قزاقستان میں آبادی کی ہیئت کے پیش نظر نیا آئین' بنیادی طور پر سیکولر اور جمہوری خطوط پر مرتب کیا گیا ہے۔ صدر نذر باشیف خود آئین کمیشن کے سربراہ تھے۔ نئے آئین میں مقننہ' حکومت اور صدر کے درمیان اختیارات میں توازن رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن سب سے سنگین مسئلہ' زبان کا ہے' تین سال پہلے زبان کے بارے میں ایک قانون منظور ہوا تھا جس کے تحت گو قزاقی زبان کو مملکت کی زبان تسلیم کیا گیا تھا لیکن روسی زبان کو ملک کی مختلف نسلوں کے مابین رابطے کی زبان قرار دیا گیا تھا۔ نئے آئین میں بھی یہی فارمولا تجویز کیا گیا ہے۔

۱۹۳۰ء تک قزاقی زبان کا رسم الخط عربی تھا لیکن وسط ایشیا کی دوسری زبانوں کی طرح قزاقی زبان کا بھی رسم الخط بدل کر روسی اختیار کیا گیا تھا۔ اب آزادی کے بعد یہ مطالبہ بڑھ رہا ہے کہ قزاقی زبان کا رسم الخط دوبارہ بدلا جائے لیکن اس سے زیادہ اہم مسئلہ خود نوجوان قزاقوں میں قزاقی زبان سے عدم واقفیت کا ہے۔

قزاق تاجر' عثمان اوتائی جو ایک طویل عرصہ کی جلا وطنی کے بعد قزاقستان آئے ہیں کہتے ہیں کہ شہروں میں بہت سے نوجوان قزاقی جانتے ہیں۔ ایسے قزاقی نوجوان جو قزاقی سے ناواقف ہیں ان کی تعداد دس فیصد سے زیادہ ہو گی۔ ویسے جہاں تک دیہات کا تعلق ہے وہاں سب قزاقی جانتے ہیں۔

جامع مسجد سے جب میں اوترار ہوٹل واپس پہنچا تو وہاں ایک قزاق نوجوان نوری کرائیوف مجھے الماعطا کے مضافات میں ایک پہاڑی گاؤں میں لے جانے کے لیے منتظر تھے۔ راستہ میں دنیا کا سب سے اونچا "اسکیٹنگ" مرکز (Medeo) پڑا۔ برف سے

ڈھکے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ اور ان کے دامن میں سرو و صنوبر کے درخت برف سے لدے ہوئے تھے۔ اس کو عبور کر کے جب ہم ایک اور پہاڑی سلسلہ کے دامن میں پہنچے تو لکڑی کے چھوٹے چھوٹے بنگلوں کی ایک بستی نظر آئی۔ اس بستی میں نوری کراؤیموف نے کار ایک بنگلے کے سامنے روک دی۔ ارغوانی حجاب پہنے ہوئے ایک بڑی بی نے ہمارا خیر مقدم کیا' یہ نوری کی نانی تھیں۔ ہم بنگلے کے اندر آتش دان کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ بڑی بی نے بڑے سے پیالے میں گرم گرم شوربہ پیش کیا اور اسی کے ساتھ قزاق زبان میں بڑی روانی سے کچھ کہنا شروع کیا۔

نوری نے بتایا کہ ان کی نانی —— پوچھ رہی ہیں کہ آپ کیسے ہیں اور آپ کے مویشی کیسے ہیں؟ میں نے کہا' میرے پاس مویشی کہاں —— نوری نے کہا کہ قزاقوں کا یہ پرانا دستور ہے کہ جب وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں یا کوئی مہمان آتا ہے تو اس سے اس کے مویشیوں کی بھی خیریت دریافت کرتے ہیں۔

اب سمجھ میں آیا کہ پرانے خانہ بدوش قزاقوں کے لیے ان کے مویشی کتنے اہم ہوتے تھے۔ اور اسی لیے اسٹالن کے زمانے میں خانہ بدوش قزاقوں کو ایک جگہ آباد ہونے پر مجبور کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر ان کے مویشی ہلاک کر دیے گئے تھے اور جب قزاقوں نے مزاحمت کی تو انہیں بھوکا مارا گیا —— ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۳ء کے دوران کہا جاتا ہے کہ دس لاکھ قزاق یوں فاقے سے مر گئے تھے —— اسی زمانے میں بہت سے قزاق چین چلے گئے اور بہت سے افغانستان۔

میں نے نوری کی نانی کی طرف غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے کی جھریوں سے اس زمانے کے ظلم و ستم کے دکھ عیاں تھے۔

لیکن جب میں ان سے رخصت ہو رہا تھا تو نوری کی نانی مجھے قزاق میں دعائیں دے رہی تھیں کہ خدا تمہیں "ایک ہزار بھیڑیں' اسی اونٹ اور آٹھ شادی شدہ بیٹے عطا کرے۔"

اور مجھے ایسا لگا کہ مجھے یہ سب کچھ مل گیا ہے۔

وسط ایشیا کے گھڑ سوار

الما عطا سے ترکمانستان کے دارالحکومت عشق آباد جانے والی پرواز تاشقند ہوتی ہوئی جاتی ہے۔

الماعطا کے ہوائی اڈے پر پہنچنے کے بعد پتہ چلا کہ تاشقند کی پرواز کی روانگی میں ایک گھنٹے کی تاخیر ہے لیکن یہ تاخیر جب تین گھنٹے کی طوالت اختیار کر گئی تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ تاشقند جانے والا طیارہ ابھی الماعطا نہیں پہنچا۔ طیارہ تاشقند سے نہیں بلکہ سائبیریا کے شہر ارکوتسک (Irkutsk) سے آرہا تھا۔

آدھے دن کے انتظار کے بعد جب میں تاشقند جانے والے طیارہ میں سوار ہوا تو طیارہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔۔۔۔ یوں کہ مسافر' قریبا بھیڑ کی کھال کے موٹے موٹے کوٹ پہنے اور الگ سے فر کے بڑے بڑے کن ٹوپ لگائے بیٹھے تھے۔ ان میں سے بیشتر گہری نیند سو رہے تھے۔

میری نشست کے برابر جو صاحب بیٹھے تھے وہ البتہ جاگ رہے تھے' میں نے ان سے پوچھا کہ طیارہ کے "ارکوتسک" سے آنے میں اتنی دیر کیوں لگی؟ کہنے لگے کہ وہاں موسم بے حد خراب ہے اور درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی ۲۵ درجہ کم ہے۔۔۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ ارکوتسک میں رہتے ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں۔ ان کا وطن منگولیا ہے اور وہ "الن بطر" سے ارکوتسک ہوتے ہوئے تاشقند جارہے ہیں' نام انہوں نے بطر شاہ بتایا۔ میں نے پوچھا بطر شاہ کا مطلب' بہادر شاہ ہے

تا؟ انہوں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کہنے لگے منگولیا کے دارالحکومت "الن بطر" کے پتہ ہے کیا معنی ہیں۔۔۔ پھر خود ہی کہا۔۔۔ لال بہادر۔۔۔ میں نے پوچھا کہ کیا وہ مسلمان ہیں؟ انہوں نے کہا کہ کیوں نام سے پتہ نہیں چلتا۔ میں نے خاموشی سے اپنی نا فہمی کا اعتراف کیا۔۔۔ بطر شاہ کہنے لگے کہ مغربی منگولیا میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے اور جب سے سوویت یونین بکھرا ہے منگولیا میں بھی تبدیلی اور جمہوریت کی لہر اٹھی ہے۔ اور خاص طور پر مسلمان ایک نئی آزادی محسوس کر رہے ہیں۔۔۔ وسط ایشیا کی مسلم جمہوریاؤں کی آزادی نے انہیں اور زیادہ تقویت بخشی ہے اور وہ ان جمہوریاؤں کے مسلمانوں سے یک جہتی محسوس کرتے ہیں۔

میں نے بطر شاہ سے پوچھا کہ وہ تاشقند کس لیے جا رہے ہیں؟ کہنے لگے کہ وہ کیمیکلز انجینئر ہیں اور انہوں نے حال میں "الن بطر" میں اپنی نجی کمپنی کھولی ہے تاشقند میں وہ اپنا دفتر کھولنے کی کوشش کریں گے۔

بطر شاہ کا ارادہ' تاشقند کے بعد پاکستان جانے کا بھی تھا۔

میں نے ان سے پوچھا کہ طیارے میں یہ دوسرے مسافر کیا ازبک ہیں۔ کہنے لگے کہ ہاں ان میں سے بیشتر ازبک ہیں جو سائبیریا کی کانوں میں کام کرتے ہیں اور اب چھٹیوں میں اپنے بیوی بچوں کے پاس وطن جا رہے ہیں۔ بطر شاہ کہہ رہے تھے کہ سوویت یونین ٹوٹنے کے بعد اب بھی وسط ایشیا کی جمہوریاؤں کے لوگ بڑی تعدا میں روس میں برسر روزگار ہیں۔ مستقبل کے بارے میں البتہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے لاکھوں روسی بھی ان آزاد جمہوریاؤں میں برسر روزگار ہیں اور یوں یہ توازن قائم ہے۔

تاشقند سے عشق آباد کے لیے جب پرواز روانہ ہوئی تو میں تھک کر چور ہو چکا تھا' نشست پر بیٹھتے ہی میں اونگھنے لگا۔۔۔ چند لمحے گذرے ہوں گے کہ کسی نے میری عینک جھپٹ لی۔۔۔ ہڑبڑا کر میں اٹھ بیٹھا۔۔۔ دیکھا کہ برابر کی نشست پر ایک نوجوان

خاتون کی گود میں بیٹھا ہوا ایک ننھا سا بچہ میری عینک ہاتھ میں لیے فاتحانہ انداز سے
مسکرا رہا ہے۔ میں نے عینک کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے میری عینک مجھے دینے کے
بجائے اپنی ماں کو دے دی۔ خیر عینک تو مجھے واپس مل گئی لیکن نیند غائب ہو گئی۔۔۔
میں نے نوٹ بک سے عشق آباد کا نقشہ نکالا اور اندازہ لگانے لگا کہ ہوائی اڈا شہر سے
کتنی دور ہے اور شہر میں عشق آباد ہوٹل کس سمت ہے جہاں مجھے ٹھہرنا تھا۔

برابر والی خاتون نے پوچھا کہ کیا میں پہلی بار عشق آباد جا رہا ہوں؟۔ میں نے
کہا۔۔ ہاں، انہوں نے کہا کہ "تبھی نقشہ دیکھ رہے ہو۔ ۔۔ پھر مسکرا کر کہا کہ عشق
آباد کے لیے نقشے کے اس قدر مطالعہ کی ضرورت نہیں۔ چھوٹا سا شہر ہے اور عشق
آباد ہوٹل، بازار، سرکاری دفاتر صدارتی محل، ریلوے اسٹیشن۔۔ غرض تمام اہم
عمارتیں، شہر کے وسط میں واقع ہیں۔

خاتون پوچھنے لگیں کہ میں کس شہر میں رہتا ہوں؟ جب میں نے بتایا کہ لندن
میں، تو خوشی کے مارے اچھل گئیں۔۔۔ کہنے لگیں کہ ڈیڑھ سال پہلے وہ اپنے میاں
کے ساتھ لندن گئی تھیں۔ میاں ان کے ترکمانستان کے ممتاز مصور ہیں جن کی تصاویر
کی نمائش آکسفورڈ میں ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا نام ہے ان کا؟ کہنے لگیں کہ
ے مک قلی ایف۔۔۔ میں نے خاتون کا نام پوچھا تو بتایا۔۔۔ سیو گلانہ۔۔۔ میں
نے کہا یہ تو روسی نام ہے۔ سیو گلانہ نے کہا بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ میں روسی ہوں اور
میرے والدین تاشقند میں رہتے ہیں جن کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کے بعد اب میں
عشق آباد واپس جا رہی ہوں۔

عشق آباد ہوائی اڈہ پر جب ہم اترے تو اس وقت موسلا دھار بارش ہو رہی
تھی۔ سیو گلانہ نے کہا کہ مارچ کا مہینہ یہاں سخت بارشوں کا ہوتا ہے۔۔ میرا دل
دھک سے رہ گیا کیونکہ میرے پاس صرف دو روز تھے عشق آباد کے لیے۔ اگر بارش کا
یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو آنا جانا دوبھر ہو جائے گا۔ ابھی میں اس تشویش میں گرفتار
تھا کہ سیو گلانہ نے ہوائی اڈے کے پھاٹک پر اپنے شوہر ے مک کو کھڑے دیکھ لیا اور
کہا کہ فکر نہ کرو۔۔ ہمارے ساتھ چلو۔ واقعی اللہ ، مسبب الاسباب ہے۔

پست قد اور اپنی گھنی داڑھی میں مسکراہٹ چھپائے ترکمان مصور سے کیک، اس وجہ حیران تھے کہ جیسے میں ان کا ہی مہمان ہوں۔ راستے میں میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں کسی ترکمان تاریخ دان یا دانشور سے ملنا چاہتا ہوں ـــــ انہوں نے مجھے ہوٹل پر اتارنے کے بعد کہا کہ وہ سیو تلانہ اور بچے کو گھر چھوڑ کر واپس آ کر مجھے ترکمانستان کے ادیبوں کی انجمن کے جنرل سکرٹری نے حسیت وردی سے ملانے لے جائیں گے۔

بیس منٹ بعد ہم ترکمانستان کے ادیبوں کی انجمن کی خوبصورت عمارت میں داخل ہو رہے تھے۔ سامنے دیوار پر ترکمانستان کے قومی شاعر مخدوم قلی کی ایک قد آور تصویر لگی ہوئی تھی۔ سے کیک، اس عمارت کے مختلف والانوں سے ہوتے ہوئے مجھے حسیت وردی کے لاؤنج تک لے گئے اور مجھے وہاں بٹھا کر انہیں بلانے چلے گئے۔

یہ نہایت حسین اور بڑے سلیقہ سے سجا ہوا لاؤنج تھا۔ اونچی اونچی کھڑکیاں جن پر مخمل کے پردے لٹکے ہوئے تھے۔ دبیز نیلا قالین جس پر قیمتی صوفہ رکھا ہوا تھا ـــ ایک طرف ساگوان کی لمبی سی میز اور اس کے دونوں طرف خوبصورت کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔

ترکمانستان کے ایک ادیب کا ایسا خوبصورت لاؤنج دیکھ کر نہ جانے کیوں میرا ذہن ہزاروں میل دور ہندوستان کے شہر کانپور کے محلے چمن گنج کی اس پتلی سی گلی میں چلا گیا جہاں ایک چھوٹے سے مکان میں جس کے دروازے پر پھٹا ہوا ٹاٹ پڑا رہتا تھا اردو کے ممتاز شاعر حسرت موہانی رہتے تھے اور گلی میں لگے بمبے سے پانی بھر بھر کر گھر میں پانی بھرتے تھے ـــ یہ بات اس زمانے کی ہے جب ہندوستان برطانیہ کا غلام تھا۔ لیکن آزادی کے بعد میں نے کراچی میں گاندھی گارڈن کے عقب میں لارنس روڈ پر پیر بخاری کے چوک کے ایک طرف لکڑی کے ایک کھوکھے میں ایک ممتاز شاعر قمر جلالوی کو زندگی گزارتے اور مشق سخن کرتے دیکھا ہے ـــ اسی کھوکھے میں ان کی سائیکلوں کی مرمت کی دکان تھی۔

میں اس خوبصورت سجے ہوئے اور آرام دہ لاؤنج میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ

ترکمانستان کے یہ ادیب اور شاعر کتنے خوش قسمت ہیں۔

اتنے میں سامنے قیمتی سوٹ پہنے نے مدسیت وردی نظر آئے جن کا چہرہ طمانیت اور خوش حالی سے چمک رہا تھا۔۔۔ نے مدسیت وردی بتا رہے تھے کہ ترکمانستان کے ادیبوں کی انجمن کے ۲۳۴ اراکین ہیں اور یہ انجمن نہ صرف ان کے مفادات کی نگرانی کرتی ہے بلکہ ان کے مالی اور دوسرے مسائل کے حل میں ان کی مدد کرتی ہے۔

اس وقت میرا دل، ترکمانستان کی تاریخ جاننے کا زیادہ خواہاں تھا۔

نے مدسیت وردی بتا رہے تھے کہ ایک ہزار سال قبل مسیح سے ترکمان قوم کی تاریخ، وسط ایشیا میں رہنے والے افراد سے منسلک ہوئی ہے۔ اس زمانے میں ترکمانستان میں "مارگیانا" اور "پارتھیا" نامی اقتصادی طور پر ترقی یافتہ دو علاقے تھے۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے آخر میں ترکمانستان، سکندر اعظم نے فتح کیا تھا۔ جس کے بعد یہاں پارتھیا سلطنت ابھری، لیکن دو سو سال قبل مسیح میں ساسانیوں نے پارتھیا سلطنت کو زیر کر کے جنوبی ترکمانستان پر قبضہ کر لیا۔

اس سے کئی صدی پہلے، ترکمانستان کا شہر مرو (MERV) زرتشت نے بسایا تھا اور یہیں سے زرتشتی مذہب ابھرا۔ اس زمانے میں بودھ مت کا بھی غلبہ تھا۔ مرو بحیرہ کیسپین سے چین تک پھیلی ہوئی شاہراہ ریشم کا ایک مرکز تھا۔

آٹھویں صدی میں عربوں کی فتوحات کے بعد بھی مرو کو بغداد کے بعد دوسرا اہم شہر مانا جاتا تھا جس کے عالی شان محلات، رصد گاہیں، کتب خانے اور کاری گر، چاردانگ عالم میں مشہور تھے۔ اس زمانے میں مرو چودہ میل کے رقبہ پر پھیلا ہوا تھا۔

نے مدسیت وردی بتا رہے تھے کہ ترکمان قوم کے تانے بانے سیر دریا اور بحیرہ کیسپین کے مشرقی ساحل کے مابین، علاقہ میں رہنے والے OGLUZ قبائل سے ملتے ہیں جنہوں نے آٹھویں صدی میں اسلام قبول کیا تھا۔ پھر ۱۰۴۰ء میں ترک سلجوقیوں نے جب اس علاقے میں اپنی سلطنت قائم کی تو ترکمان قوم نے واضح شکل اختیار کی۔

۱۳ ویں صدی میں جب چنگیز خان نے اس علاقہ پر حملہ کیا تو یہاں خوارزم

شاہوں کی حکومت تھی۔ ۱۴ ویں صدی میں تیمور نے اس علاقے پر قبضہ کیا اور پھر اٹھارہویں صدی میں ترکمانستان' نادر شاہ کی فوجوں کا شکار بنا۔ ۱۹ ویں صدی کے آخر میں زار روس کے اس علاقے میں قبضہ کے وقت یہ خیوا کے خان کی ریاست کا حصہ تھا۔ پھر ۱۹۱۷ء میں ترکمانستان میں کمونسٹ دور شروع ہوا جو پچھلے سال تک سویت یونین کے بکھرنے تک جاری رہا۔

ترکمانستان پر کمونسٹ نظام کے غلبہ کے آغاز پر ترکمانستان نے اس کی شدید مزاحمت کی تھی۔ اس زمانے میں سویت نظام کے خلاف لڑنے والے بیشتر ترکمان گھڑ سوار تھے۔ لہٰذا' سویت حکومت نے ترکمانوں کو گھوڑے رکھنے کی ممانعت کر دی تھی۔ اور یہ پابندی دو سال پہلے تک جاری تھی۔

ترکمانستان کے ادیبوں کی انجمن کے جنرل سکریٹری نے حسیت وردی سے ملاقات کے بعد جب میں اپنے ہوٹل واپس پہنچا تو عشق آباد میں پہلے امریکی سفارت خانہ کے افتتاح کی تقریب کا دعوت نامہ ملا۔۔۔ مجھے تعجب ہوا۔ امریکیوں کو میرے بارے میں کیسے پتہ چلا جب کہ صبح ہی میں عشق آباد آیا ہوں۔۔۔۔ لیکن معلوم ہوا ان ٹورسٹ والوں سے انھیں میرے بارے میں پتہ چلا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ امریکی' عشق آباد میں بڑی عجلت میں اپنا سفارت خانہ قائم کر رہے ہیں' کسی باقاعدہ عمارت کے انتظام سے پہلے ہی' ایک ہوٹل میں۔

ترکمان مصور رے تک کا کہنا تھا کہ امریکی عجلت کی ایک بڑی وجہ ایران سے رقابت اور تشویش ہے۔ ترکمانستان کی سرحدیں' ایک طرف ایران اور دوسری طرف افغانستان سے ملتی ہیں اور ایران عشق آباد میں سفارت خانہ قائم کرنے والا پہلا ملک ہے۔

پھر' اسی روز جب امریکی سفارت خانہ کے افتتاح کی تقریب ہوئی' ایران کا ایک قافلہ' عشق آباد پہنچا تھا جس کی کوچوں پر امام خمینی کی تصاویر چسپاں تھیں۔ اس موقع پر ایرانی قافلہ نے امام خمینی کے اس خط کی نقول تقسیم کیں جو انھوں نے سابق سویت یونین کے صدر گورباچوف کو لکھا تھا اور جس میں انھیں اسلام قبول کرنے کی

دعوت دی تھی۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ امریکہ نے اس ہوٹل کے سامنے واقع ہوٹل میں اپنا سفارت خانہ قائم کیا ہے جہاں ایرانی سفارت خانہ قائم ہوا ہے۔

وسط ایشیا کا کویت؟

عشق آباد میں امریکی سفارت خانہ کے افتتاح کی تقریب گو سہ پہر کو منعقد ہوئی لیکن رمضان المبارک کے احترام میں ضیافت کا اہتمام افطار کے بعد کیا گیا تھا۔

امریکیوں کے اس فیصلہ سے یہ بات عیاں تھی کہ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ انہیں ترکمانوں کے مذہبی جذبات کا بخوبی احساس ہے لیکن شہر میں جو ایران کی سرحد سے صرف تیس ۳۰ میل دور ہے کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ مہینہ رمضان المبارک کا ہے۔

ضیافت کے بعد ترکمانستان کے ممتاز فلم ہدایت کار' بابا شیعت محمت امان اپنے گھر لے جانے کے لیے میرا انتظار کر رہے تھے۔

ان کا خوبصورت گھر' عشق آباد کے مرکزی علاقے میں وزیروں کی کوٹھیوں کے بیچ میں تھا۔ بیوی ان کی بالٹک کی جمہوریہ لیتھونیا کی ہیں۔ کہاں کیسپین کی جنوب مشرق میں ترکمانستان اور کہاں وسیع ریگستان اور اس کے بعد قزاقستان اور پھر روس سے بھی پرے شمال میں لیتھونیا۔ میرے تعجب پر بابا شیعت محمت امان کو اچنبھا ہو رہا تھا۔ ترکمانستان میں پندرہ فیصد کے قریب روسی' یوکرینی اور سابقہ سوویت جمہوریاؤں کے لوگ آباد ہیں اور یہ اپنی الگ الگ زبانوں' مذہب اور ثقافتوں کے باوجود ایک دوسرے میں گھلے ملے ہوئے ہیں۔ بابا سیف محمت امان گھر میں روسی زبان بول رہے تھے لیکن فلمیں انہوں نے ترکمان اور روسی دونوں زبانوں میں بنائی ہیں۔

پرلیس زانیکا کے بعد ان کی پہلی فلم' ترکمانستان میں منشیات کے مسئلہ کے بارے میں تھی- جسے فن لینڈ میں انعام ملا تھا- دوسری فلم' ان کی گھوڑوں پر عشق آباد سے' ماسکو تک سفر پر تھی- اس فلم کے بعد ترکمانوں پر گھوڑے رکھنے کی وہ پابندی ختم ہوئی جو ۳۰ء سے انقلاب دشمنی کے الزام میں ان پر سزا کے طور پر عائد تھی- کمونسٹ انقلاب کے اوائل میں ترکمانستان کی مزاحمتی تحریک کے افراد گھوڑوں پر سوار' چھاپہ مار حملے کرتے تھے اور یہ اتنے ماہر گھڑ سوار تھے کہ اشتراکی حکمرانوں کے قبضے میں نہیں آتے تھے-

آخر کار اشتراکی حکومت نے ان گھڑ سواروں کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے ایک حکم کے ذریعہ' ترکمانوں پر گھوڑے رکھنے کی پابندی عائد کر دی اور جس ترکمان کے پاس گھوڑا نظر آتا تھا حکام اسے ضبط کر لیتے تھے- اس طرح اشتراکیوں نے مزاحمتی تحریک کی کمر توڑ دی اور ترکمانوں سے ان کی روایت چھین لی- یہ پابندی اتنی سخت تھی کہ کسی کو اس کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی حتیٰ کہ اسٹالن کے بعد بھی یہ پابندی برقرار رہی-

بابا شیف صحت امان کی فلم کے بعد ترکمانوں نے گھوڑے رکھنے کی اس پابندی کے خلاف آواز اٹھائی اور گورباچوف کی حکومت نے اس پابندی کو ختم کیا-

تیسری فلم بابا شیف صحت امان کی' خواتین کے جیل خانہ کے بارے میں تھی جس کے بعد صدر نیازوف نے اس جیل میں ایک زمانہ سے قید ایک سو سے زیادہ خواتین کو معافی دینے اور انہیں رہا کرنے کا حکم دیا-

----

عشق آباد میں یہ میری آخری رات تھی چنانچہ میں نے پوری رات بیٹھ کر بابا شیف صحت امان کی یہ تینوں فلمیں دیکھیں-

----

ترکمانستان' وسط ایشیا کا سب سے آخری علاقہ تھا جس پر زار روس کا تسلط ہوا

تھا۔ سخت مزاحمت اور لڑائی کے بعد۔۔۔ اور جب ۱۹۲۵ء میں ترکمانستان' سوشلسٹ جمہوریہ کی حیثیت سے سوویت یونین میں شامل کیا گیا تو اس وقت بھی ترکمانوں نے سخت مزاحمت کی تھی۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اگست ۱۹۹۱ء کی ناکام بغاوت سے پہلے سوویت یونین کے اتحاد اور اسے برقرار رکھنے کے لیے جو کوشش ہو رہی تھی اس کی حمایت میں ترکمانستان پیش پیش تھا۔

غالباً اس کی وجہ' ترکمانستان میں سپر مراد نیازوف کی قیادت ہے۔ نیازوف ۸۵ء سے جب سے گورباچوف برسراقتدار آئے تھے' ترکمانستان کی کمونسٹ پارٹی کے سربراہ تھے اور اکتوبر ۹۰ء میں انہوں نے ۹۸ فیصد ووٹ سے صدارتی انتخاب جیتا تھا۔ سوویت یونین کے بکھرنے اور ترکمانستان کی آزادی کے بعد گذشتہ جون میں دوبارہ یہ صدارتی انتخاب ہوا اس میں بھی سپر مراد نیازوف ۹۰ فیصد سے زیادہ کی اکثریت سے صدر منتخب ہوئے۔ ۹۰ء میں کوئی ان کے مقابلہ پر نہیں کھڑا ہوا تھا اور نہ اس بار کوئی ان کا مد مقابل تھا۔

صدر نیازوف کی شخصیت کے بارے میں جب میں نے ترکمانستان کے تاریخ داں' نے ہیسف وردی سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ سپر مراد نیازوف' غیر معمولی شخصیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نیازوف کے والدین ان کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے' لہذا ان کی نگہداشت یتیم خانہ میں ہوئی' تعلیم انہوں نے انجینئرنگ کی' سینٹ پیٹرس برگ میں حاصل کی اور روسی خاتون سے شادی کی' اس لحاظ سے ان پر روس کی گہری چھاپ ہے۔

ہیسف وردی کہہ رہے تھے کہ ترکمانستان میں جہاں کا معاشرہ اب بھی قبائلی ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کون کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے' صدر نیازوف' کمونسٹ پارٹی کے کارکن کی نچلی سطح سے ابھر کر اعلیٰ قیادت تک پہنچ گئے۔

آزادی کے بعد کمونسٹ پارٹی نے نام بدل کر' ترکمانستان میں' ڈیموکریٹک پارٹی رکھ لیا۔ ویسے پارٹی کا وہی پرانا ڈھانچا برقرار ہے۔

تو اس پرانی کمونسٹ قیادت کے برقرار رہتے ہوئے' عوام کیا واقعی آزادی کے بعد کوئی تبدیلی محسوس کرتے ہیں؟

یہ سوال جب میں نے عشق آباد میں صدر نیازوف کے ایک قریبی معتمد اور وزیر صنعت' آنا سیف امیرے سے کیا تو انہوں نے بڑی بے باکی سے کہا جی ہاں۔ میں بھی پرانا کمونسٹ ہوں۔ لیکن ہماری فکر میں تبدیلی آئی ہے اور اب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں مرکزی منصوبہ بندی اور اقتصادی کنٹرول کے بجائے آزاد معیشت کا انداز اختیار کرنا چاہیے۔ عوام بھی بڑی حد تک یہی محسوس کرتے ہیں اور بھلے پرانی کمونسٹ قیادت ہو لیکن یہ عوام کی مرضی کے مطابق ان کی بھلائی کو سامنے رکھتے ہوئے نئی راہ اختیار کر رہی ہے۔

ترکمانستان کا رقبہ' فرانس کے برابر ہے لیکن آبادی محض چالیس لاکھ ہے۔ پیرس کی آبادی سے بھی کم ہے۔ ملک کا ۸۵ فیصد ریگستان ہے لیکن تیل' قدرتی گیس اور کپاس سے مالا مال ہے۔ اس وقت تیل ہر سال ۵۵ لاکھ ٹن پیدا ہوتا ہے' قدرتی گیس کی پیداوار اس کے لگ بھگ ہے۔ اور کپاس ڈھائی لاکھ ٹن پیدا ہوتی ہے—— نے سوویت دور کے ماہرین کہتے ہیں کہ ترکمانستان چند برسوں کے اندر اندر کویت کے برابر مالدار ملک بن سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ترکمانستان میں ایک اندازہ کے مطابق ۸ ارب ٹن تیل کے ذخائر ہیں اور قدرتی گیس کے بھی کم و بیش اتنے ہی وافر ذخائر ہیں۔ ترکمانستان اب تک سوویت یونین کی جمہوریاؤں کو بہت کم قیمت پر تیل فراہم کرتا تھا لیکن اب آزادی کے بعد وہ تیل اور قدرتی گیس' اچھی قیمت پر برآمد کر سکتا ہے۔

قدرتی گیس اور تیل اور دوسرے قدرتی وسائل کی بدولت مستقبل روشن سہی لیکن اس وقت جب سے ملک میں آزاد معیشت کی پالیسی اپنائی گئی ہے' ہر چیز کے دام کم سے کم تین گنا بڑھ گئے ہیں۔

آدھی سے زیادہ آبادی اب بھی کاشت کاری پر انحصار کرتی ہے اور گو خوراک کی اشیاء کی قلت نہیں لیکن قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے خوراک عوام کی دست

رس سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ اوسط آمدنی ایک ہزار روبل ماہانہ فی کس ہے لیکن اس وقت گوشت کے دام' پچاس روبل فی کلو ہیں اور پیٹرول ۲ روبل فی لیٹر ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ روس اور سابقہ سوویت یونین کی دوسری جمہوریاؤں کے مقابلہ میں صدر نیازوف نے ترکمانستان میں معاشی ڈھانچے میں تبدیلی کے سلسلہ میں آہستہ روی اختیار کی ہے۔ انہوں نے صاف کہا ہے کہ جائداد ابھی نجی سرمایہ کاروں کو نہیں دی جائے گی اور معیشت کے بعض شعبے اب بھی حکومت کے کنٹرول میں رہیں گے کیونکہ ان کے نزدیک یہ دور عبوری ہے اور بے حد پر خطر ہے۔

ایک مسئلہ' فوج کا ہے۔ اس وقت سابقہ سوویت فوج جو اب آزاد جمہوریاؤں کی دولت مشترکہ کی فوج کہلاتی ہے ترکمانستان میں تعینات ہے۔ ترکمانستان کی آبادی کم اور سرحدیں لمبی ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر اپنی فوج کی تشکیل کے بارے میں کیا پالیسی ہے؟ یہ سوال جب میں نے ترکمانستان کے وزیر خارجہ عبدی قلی اسیف سے کیا تو انہوں نے کہا کہ فوج کی تشکیل' محض آبادی پر منحصر نہیں۔ یقیناً مستقبل میں ترکمانستان کی اپنی فوج ہوگی لیکن اس کا دارومدار اس بات پر ہوگا کہ ہمارے پڑوسی ملکوں کے ساتھ ہمارے کس نوعیت کے تعلقات رہتے ہیں۔ ویسے یقیناً ترکمانستان اپنے نیشنل گارڈ منظم کریگا۔

لیکن ترکمان دانشور نے عصمت وردی کا کہنا ہے کہ ہمیں فوج کی ضرورت نہیں۔ ہمارے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان دوستانہ تعلقات کو فروغ دیں اور ایسی صورت پیدا ہو کہ فوج کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

بلاشبہ' بہت سے ترکمانوں کی یہی خواہش ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں بڑی حد تک بے بس ہیں۔ ماسکو میں دولت مشترکہ کی فوج کی ہائی کمان' ایران اور افغانستان کی سرحد پر ـــــ فوج کی موجودگی برقرار رکھنا چاہتی ہے اور جہاں تک ترکمانستان کے حکمرانوں کا تعلق ہے تو انہیں اس بات کا احساس ہے کہ وہ فی الفور اپنی نئی فوج منظم نہیں کرسکتے' لہٰذا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ترکمانستان میں CIS

(دولت مشترکہ) کی فوج برقرار رہے۔

مستقبل میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ مشترکہ دفاع کے بارے میں ترکمانستان اور روس کے مابین کوئی سمجھوتا طے پا جائے۔

اس امکان کے پس پشت' آزادی کے بعد ترکمانستان میں مسلم بنیاد پرستی ابھرنے کا خدشہ ہے۔ لیکن وزیر صنعت اتاسیف امیر کا کہنا ہے کہ ترکمانستان میں مذہبی کٹر پن نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بلاشبہ ماضی میں ترکمانستان میں عوام کی مذہب سے گہری دلچسپی رہی ہے لیکن ان میں کٹر پن کبھی نہیں رہا۔ پھر گذشتہ ۷۰ برس کے دوران' مذہبی جماعتیں ممنوع رہی ہیں اور اب بھی نئے آئین کے تحت مذہبی بنیاد پر جماعتوں کی تشکیل پر پابندی ہے۔ لہذا ترکمانستان میں بنیاد پرستی ابھرنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ عوام کی اکثریت اب بھی مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھنے کی حامی ہے۔

اور سحری کے وقت جب میں فلم ہدایت کار' امان کے ہاں سے ہوٹل لوٹ رہا تھا تو شہر کے اس وسطی علاقہ میں کہیں بھی ایسی چہل پہل اور ہماہمی نظر نہیں آتی تھی جیسی کہ سحری کے وقت ہوتی ہے۔ لیکن ہوٹل میں ایرانی وفد کے اراکین' ایک دوسرے کے کمرے کھٹکھٹا کر سحری کے لیے جگا رہے تھے۔

باب ۲۱

واپسی

ترکمانستان کے دارالحکومت عشق آباد سے ماسکو کی پرواز علی الصبح تھی۔ میں چونکہ ترکمان فلم ہدایت کار صمت امان کے ہاں سے سحری کے وقت ہوٹل واپس پہنچا تھا اس لیے اس وقت وہاں سے ہوائی اڈے روانہ ہو گیا۔

ہوائی اڈے پہ دیکھا کہ ترکمان تاریخ دان نے مدسیت وردی بھی ماسکو جا رہے ہیں۔ پتہ چلا کہ ماسکو کی پرواز میں دو گھنٹے کی تاخیر ہو گئی ہے۔ پریشانی اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ اس دوران نے مدسیت وردی سے مزید اور قدرے تفصیل سے گفتگو کا موقع ملا۔

نے مدسیت وردی پوچھنے لگے کہ میں وسط ایشیا کے اس سفر میں کہاں کہاں گیا؟ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں ازبکستان میں تاشقند، سمرقند، بخارا اور نامن گان۔۔۔۔ تاجکستان میں دوشنبہ اور قزاقستان میں الماعطا جا چکا ہوں اور اب عشق آباد سے ماسکو کے راستے لندن واپسی ہے تو کہنے لگے کہ کرغزستان نہیں گئے؟ میں نے کہا کہ الماعطا سے بشکیک جانے کا ارادہ تھا لیکن ایک تو شدید برف باری کی وجہ سے موسم خراب تھا دوسرے تیل کی کمی کے سبب وہاں جانے والی پروازوں میں سخت گڑ بڑ تھی۔

نے مدسیت وردی نے کہا کہ کرغزستان جائے بغیر وسط ایشیا کی موجودہ تصویر پوری نہیں ہو سکے گی۔ دل ہی میں نے ان سے اعتراف کیا لیکن وجہ اس کی وہ کیا سمجھتے ہیں۔ یہ جاننے کے لیے میں نے سوال کیا وہ کیسے؟

نے صدیف وردی نے جواب دیا کہ کرغزستان' کو وسط ایشیا کی سب سے چھوٹی جمہوریہ ہے اور بالکل انتہائی مشرق میں واقع ہے لیکن وسط ایشیا کی جمہوریاؤں میں سب سے پہلی جمہوریہ ہے جس نے ۲۰ اگست ۹۱ء کو ناکام بغاوت ماسکو کے فوراً بعد ۳۱ اگست ۹۱ء کو آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ پھر سب سے پہلے کرغزستان میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کی گئی۔

وردی کہہ رہے تھے کہ یہ بات بھی اہم ہے کہ امریکہ کے اس زمانے کے وزیر خارجہ جیمس بیکر نے وسط ایشیا میں سے پہلے کرغزستان کا دورہ کیا تھا اور دوسری جمہوریاؤں سے پہلے بشکیک میں اپنا سفارت خانہ قائم کیا تھا۔

میں نے پوچھا کہ وجہ اس کی کیا تھی؟

وردی نے بتایا کہ ایک تو یہی کہ کرغزستان نے سب سے پہلے کمیونسٹ پارٹی کو ممنوع قرار دیا۔ دوسرے یہ کہ کرغزستان' چین کی سرحد پر واقع ہے۔ ویسے شمال میں اس کی سرحدیں' قزاقستان سے مغرب میں ازبکستان سے اور جنوب میں تاجکستان سے ملتی ہیں۔

پھر ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں تیل' قدرتی گیس اور کوئلہ کے علاوہ یورینیم کے بھی وافر ذخائر ہیں۔ رقبہ کرغزستان کا صرف ساڑھے اکہتر (۷۱) ہزار مربع میل ہے اور آبادی چوالیس ۴۴ لاکھ ہے۔ دارالحکومت کا نام پہلے ریڈ آرمی کے جنرل فرونزے کے نام پر تھا جنہوں نے وسط ایشیا کا بیشتر علاقہ فتح کیا تھا لیکن اب آزادی کے بعد نام بدل کر پرانا نام بشکیک رکھا گیا ہے۔ لیکن بشکیک کی اب بھی آدھی سے زیادہ آبادی روسیوں پر مشتمل ہے۔

کرغزستان کے صدر' ۴۸ سالہ عسکر آقا ییف اکتوبر ۹۰ء میں صدر منتخب ہونے سے پہلے اکاڈمی آف سائنسز کے چیئرمین تھے۔ انہوں نے اپنے انتخاب کے فوراً بعد' کرغزستان کی جمہوریہ کے نام سے لفظ سویت حذف کر دیا تھا۔ ۲۰ اگست ۹۱ء کو جب ماسکو میں ناکام بغاوت ہوئی تھی صدر عسکری آقا ییف نے سب سے پہلے اس کی مذمت کی تھی اور اس کے فوراً بعد اپنے ساتھیوں سمیت کمیونسٹ پارٹی سے علیحدگی

اختیار کر لی تھی۔ ۳۱ اگست ۱۹۹۱ء کو اعلان آزادی کے بعد' اکتوبر میں انہوں نے دوبارہ صدارتی انتخابات کرائے اور آزاد کرغزستان کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

میں نے' دردی سے پوچھا کہ کرغزستان میں کیا کوئی حزب مخالف نہیں؟

انہوں نے کہا کہ حزب مخالف ہے اور دو تنظیمیں ہیں' ایک ASABA کے نام سے ہے جس کے معنی پرچم ہیں اور دوسری تنظیم آزاد کرغزستان پارٹی ہے۔ لیکن صدر عسکری آقا سیف بہت مقبول ہیں اور سیاسی افق پر وہی چھائے ہوئے ہیں۔

ایرفلوٹ کے طیارے نے جب عشق آباد سے ماسکو کے لیے اڑان بھری تو اس بات کا قلق تھا کہ میں کرغزستان نہ جا سکا۔ اسی کے ساتھ ایک عجب سی کسک محسوس کر رہا تھا وسط ایشیا کی سرزمین سے رخصت ہوتے ہوئے۔ یادوں کا ایک ہجوم تھا جو اس سفر کے دوران میرے ہم رکاب ہو گیا تھا۔ میں نے طیارے کی کھڑکی کے باہر جھانکا' نیچے ترکمانستان کا ریگستان دور تک پھیلا ہوا تھا جس پر سورج کی کرنیں مچل رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس ریگستان نے کتنے فاتح اور کتنے انقلاب دیکھے ہیں۔ سکندر اعظم بھی توسیع پسند پھریرے لہراتا ہوا یہاں سے گذرا' عرب یہاں اسلام کی روشنی لے کر آئے۔ پھر مشرق سے چنگیز خان اور اس کے منگولوں کا تباہ کن طوفان اٹھا جس نے اس پورے علاقہ کی زندگی' تہذیب اور ثقافت ملیا میٹ کر دی۔ پھر تیمور نے اس پورے علاقے پر اپنی عالی شان سلطنت قائم کی اور پھر چند صدیوں بعد یہ علاقہ یکے بعد دیگرے دو طوفانوں کی زد میں آیا۔ پہلے زار روس کے حملے اور پھر کمیونسٹ انقلاب کے تسلط کی شکل میں۔

اب سوویت یونین کے بکھرنے اور ان جمہوریاؤں کے آزاد ہونے کے بعد جن کی سرحدیں ۱۹۲۰ء میں کمیونسٹ دور میں کھینچی گئی تھیں اس پورے علاقہ نے نئی اور آزاد فضا میں سانس لی ہے۔

یوں کم و بیش ایک سو تیس (۱۳۰) سال بعد آزاد ہونے پر کیسپین کے ساحل

سے تین شین کے پہاڑوں کے دامن تک پھیلے ہوئے وسط ایشیا کے عوام پہلی بار اپنے مذہبی تشخص' اپنی قومی پہچان اور اپنی علاقائی شناخت کی آزمائش سے گذر رہے ہیں۔ یک بیک نظریاتی نو آبادیاتی دور ختم ہوا ہے اور اچانک کمونزم کا لبادہ اتر گیا ہے۔ یہ دوہری آزمائش ہے اصل میں۔

وسط ایشیا کے اس سفر کے دوران' بار بار میرے ذہن میں یہ سوال اٹھا کہ فارسی بولنے والے تاجکوں کے علاوہ اس علاقہ میں رہنے والے سب' ترک نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور زبان کا بھی مخزن ایک ہے تو کیا اس کا امکان نہیں کہ یہ سرحدیں جو کمونسٹ دور میں کھینچی گئی تھیں' عوام یہاں کے مٹا دیں اور ایک ہو جائیں؟

مجھے یاد ہے کہ یہ سوال جب میں نے اسلام آباد یونیورسٹی میں وسط ایشیا کے مطالعہ کے مرکز کے سربراہ ڈاکٹر احمد حسن دانی سے کیا تھا تو انہوں نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ یہ ضروری نہیں کہ یہ سرحدیں ختم ہو جائیں کیونکہ جب سرحدیں بن جاتی ہیں تو سیاسی مفادات اور اقتصادی مفادات پیدا ہو جاتے ہیں' سیاسی جماعتیں بن جاتی ہیں پھر وہ سرحدوں کو اور سرحدیں انہیں قائم رکھتی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ان میں آپس میں اتفاق رائے ہو' تعاون ہو اور ممکن ہے کہ آئندہ' چل کر ان کی کنفڈریشن بھی بن جائے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ موجودہ سرحدیں ختم ہو جائیں اور میرے خیال میں پرانا پین ترک نظریے کے بھی دوبارہ ابھرنے کا کوئی امکان نہیں۔ نہ پین ترک اور نہ پین اسلام نظریہ ابھرنے کا امکان ہے۔ مغرب میں جب اس بات پر شور مچایا جاتا ہے کہ یہاں ایک اسلامک فیڈریشن بننے کا امکان ہے تو یہ بھی غلط ہے۔ یہاں اس کا بھی امکان نہیں۔ کیونکہ آج تک دنیا میں کہیں بھی اسلام کے نام پر وفاق نہیں بنا۔

ہم نے اسلامی کانفرنس کی تنظیم OIC اور RCD بھی قائم کر لی ہے لیکن ان تنظیموں میں وہ سیاسی اتحاد نہیں جو وفاق میں ہوتا ہے۔ وسط ایشیا کے ملکوں میں' اقتصادی طور پر تعاون تو فروغ پا سکتا ہے لیکن مذہب کے نام پر وفاق بننے کا کوئی امکان نہیں۔

لیکن تاشقند میں پاکستانی تجارتی ادارے کی تابانی کارپوریشن کے کرتا دھرتا، عباس خان جو ایک عرصہ سے وسط ایشیا میں مقیم ہیں اور یہاں کے لوگوں اور ان کے انداز فکر سے گہری واقفیت رکھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہاں عوام کے دلوں میں دوبارہ اتحاد کا جذبہ موجود ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب سابق سوویت یونین میں پریس ترائیکا شروع ہوا تو یہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال ابھرا تھا کہ اس علاقہ میں دوبارہ عظیم توران کی تشکیل کی جائے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ محض خیال ہے اور ابھی اس مقصد کے لیے کوئی تحریک نہیں اٹھی۔ صرف ماضی کے حوالے سے یہ خیال لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوا ہے' ویسے سوشلزم کی آمد سے پہلے بھی یہاں ریاستیں اور مختلف امارات تھیں جو ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ رہی تھیں اور ساتھ بھی رہ رہی تھیں۔ اصل میں ان کی آپس کی لڑائیوں سے ہی زار روس نے فائدہ اٹھایا تھا۔ موجودہ جمہوریائیں سوشلزم کے دور میں بنی تھیں۔ اس سے پہلے تین بڑی ریاستیں تھیں۔ بخارا' خوارزم اور خیوا کی۔ اب وسط ایشیا کی پرانی سوویت جمہوریائیں' آزاد ملک کی حیثیت سے ابھری ہیں۔ لیکن کچھ بھی ہو لوگوں کے ذہنوں میں ایک عظیم توران کے قیام کا خیال ہے۔ ایک خواب کی طرح۔"

اس علاقہ میں کمیونسٹ دور میں جس طرح مختلف قومیتوں کے جذبہ کو فروغ دیا گیا کیا اب آزادی کے بعد قومیتوں کا یہ احساس ختم ہو جائے گا اور ایک قوم کے تصور کے ابھرنے کا امکان ہے؟ یہ سوال جب میں نے ازبکستان کے ممتاز دانش ور ڈاکٹر تاش مرزا سے کیا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ پورے ترکستان کو ایک ریاست بنانا ممکن نہیں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے۔ یہ ملک ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں' ان میں ہم آہنگی بھی پیدا ہو سکتی ہے لیکن یہ اپنے ریاستی تشخص اور سلامتی کو ختم نہیں کریں گے۔ پرانے ترکستان کی طرف لوٹنے کا اب کوئی راستہ نہیں رہا۔ اس علاقہ میں کچھ بڑی جمہوریائیں ہیں اور کچھ چھوٹی۔ بڑے ترکستان کی تشکیل کی کوشش کی گئی تو چھوٹی جمہوریاؤں کو اپنی الگ حیثیت کے خاتمے کے علاوہ بڑی جمہوریاؤں میں مدغم ہونے کا خطرہ ستائے گا اور یہی بات اتحاد کی راہ میں حائل ہوگی۔ غرض ان جمہوریاؤں

کا کنفڈریشن تو بن سکتا ہے لیکن ان کی الگ حیثیت ختم نہیں ہو سکتی۔

بہر حال یہ تو مستقبل کی بات ہے۔ اس وقت وسط ایشیا کے عوام کے لیے سب سے بڑا چیلنج اپنا تشخص تلاش کرنا ہے جو پچھلی ایک صدی کے نوآبادیاتی دور اور نظریاتی استبداد کے دوران کھو بیٹھے ہیں۔ انھیں ان اعلا روایات کی تجدید کرنی ہے جو علی شیر نوائی، فارابی، رودکی، امام بخاری، اور تیمور اور بابر سے عبارت ہیں۔

پھر وسط ایشیا کے عوام کے سامنے ایک بڑا چیلنج اپنی آزادی کے استحکام کے ساتھ سنگین اقتصادی مسائل کو حل کرنا ہے جو انھیں کمونسٹ نظام کی معیشت کو آزاد معیشت میں تبدیل کرنے کے سلسلہ میں درپیش ہیں۔

وسط ایشیا کی ان جمہوریاؤں کے پاس وافر وسائل ہیں اور اس کے ساتھ وہ عزم اور حوصلہ ہے جس کے سہارے انہوں نے پچھلے ستر برس کے اشتراکی دور میں بھی اپنے مذہب، اپنی تہذیب اور اپنی روایت کو زندہ رکھا ہے۔

وسط ایشیا کی ان نو آزاد جمہوریاؤں کا سفر ختم ہو رہا تھا اور میں لندن واپس آرہا تھا لیکن راستے بھر میرے ذہن میں اقبال کا وہ ترانہ گونج رہا تھا جو میں نے تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبہ کے آزدی چوک میں تاجکوں کو والہانہ انداز سے گاتے سنا تھا اور اب بھی جب میں اس ترانے کی گونج اپنے ذہن میں سنتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ راوی کے کنارے۔۔۔ دوشنبہ کے دریا سے آن ملے ہوں۔

"از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز"